منبر و عصا

عن معاذ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اتخذ منبراً فقد اتخذہٗ ابی ابراھیم وان اتخذ العصا فقد اتخذہ ابی ابراھیم صلی اللہ علیہما وسلم[1]

مذہب اسلام جس قدر سادہ اور عام فہم ہے اسی قدر اس کی عبادت میں کسی پُراسرار چیز کو دخل نہیں۔ نہ ایسے مذہبی مراسم ہیں جن کے ادا کئے بغیر عبادت مکمل نہ ہوتی ہو۔ اور نہ عوام کے دلوں کو مسخر اور مرعوب کرنے والی باتیں ہی ہیں۔ جن سے مذہب کو ایک بھیانک اور ڈراؤنی چیز بنا کر انہیں قابو میں رکھا جائے یہی وجہ ہے کہ دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کے برعکس، مسجد ایک کھلی ہوئی، روشن اور ہوادار عمارت ہوتی ہے۔ جس میں نہ کوئی نیم تاریک جگہ ہوتی ہے اور نہ ساز و سامان ہی پایا جاتا ہے۔ ہر مسجد کے ساز و سامان میں صرف ایک منبر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ محراب ہر چھوٹی اور بڑی مسجد میں پائی جاتی ہے مگر یہ عمارت کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ اور اس میں بھی کوئی پُراسرار چیز نہیں ہوتی بڑی مسجدوں میں ایک حوض ہوتا ہے۔ جس کا پانی وضو کرنے کے کام آتا ہے منبر کے علاوہ محراب بھی مسجد کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ صدر اسلام کی چیز نہیں۔ چنانچہ نہ تو سب سے پہلی مسجد نبوی میں محراب تھی نہ اُس مسجد میں محراب تھی جو حضرت عمرو بن العاص نے سنہ ۲۱ھ میں فسطاط میں

---

[1] سمہودی۔ ج ۱۔ ص ۲۸۲،

تعمیر کرائی، اور مسجد نبوی کے بعد یہی مسجد اسلام کی قدیم ترین مسجد ہے
پہلے عہد ولید میں حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنی ولایت مدینہ کے زمانے میں،
جب مسجد نبوی دوبارہ تعمیر کرائی ہے تو خلیفہ کے حکم سے وہاں "محراب مجوّف"
بنوائی تھی، اسی زمانے میں اور اسی خلیفہ کے حکم سے قرۃ بن شریک نے ۹۲ھ میں
حاکم مصر ہونے کی حیثیت سے مسجد عمرو بن العاص کو دوبارہ تعمیر کرایا، اور ایسی ہی
"محراب مجوّف" وہاں بنوائی[1]۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ محراب زیادہ سے زیادہ
خلیفہ ولید کے عہد کی چیز ہے۔ اس کے بعد صرف منبر ہی ایسی چیز رہ جاتی ہے
جسے ہم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی پاتے ہیں۔ اور تاریخی لحاظ سے
پتہ چلا سکتے ہیں کہ آپ ہی نے سب سے پہلے مسجد نبوی میں منبر نصب کرایا تھا[2].
اور آجکل منبر پر کھڑے ہو کر خطیب خطبہ پڑھتا ہے ؛

(۱)

اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ منبر کہاں سے آیا، اور آیا اسلام سے
قبل بھی یہ عربوں میں رائج تھا یا نہیں ؟ خود عرب لغویین منبر کو نبر سے مشتق
بناتے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ اسے منبر اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ مرتفع ہوتا ہے[3]
لیکن جرمانی مستشرق شوالے (Schwally) کی تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ منبر
حبشی زبان کا لفظ ہے اور وہیں سے عربوں نے اسے اختیار کیا[4]۔ جو اقوال
شوالے نے نقل کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ منبر سے بیٹھنے کی جگہ
مراد لی جاتی تھی۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ بتوں کو رکھنے کے لئے جو بلند جگہ بنائی جاتی تھی

---

[1] ابن تغری بردی ج ۱ ص ۷۶، ۸۰، + سمہودی ج ۱ ص ۳۷۲ + خطط ج ۲ ص ۲۴۷ + حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۱۳۵، ۱۳۶

[2] الساری ج ۲ ص ۱۷۱، [3] کل مرتفع منتبر وکل ما رفعتہ فقد نبرتہُ۔ الجوہری: نبرت الشیٔ نبرہٗ نبراً رفعتا والمنبر مرقاۃ الخاطب سمی منبراً لارتفاعہ وعلوہ (لسان) [4] منقول از بکر ج ۱ ص ۴۵۱ + اس کتاب سے جس حد تک استفادہ کیا گیا ہے اس کا اندازہ ان چند حوالوں سے نہیں ہو سکتا۔ جو حواشی زیرین میں ملیں گے،

وہ منبر کہلاتی تھی۔ بلکہ اس کے علاوہ تلواروں اور بھلوں کو رکھنے کی جگہ کو بھی منبر کہتے تھے، اور یہ بالعموم لکڑی کے ہوتے تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ صدر اسلام میں بھی منبر لکڑی ہی کے بنائے جاتے تھے۔ یہ مرتفع جگہ کرسی یا تخت ہی کے قسم کی کوئی جگہ ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ابن خلدون نے اسے کرسی یا تخت کا مترادف بنایا ہے۔ وہ لکھتا ہے: " اما السریر والمنبر والتخت والکرسی ھو اعواد منصوبۃ وارائک منضدۃ لجلوس السلطان علیہ مرتفعا عن اھل مجلسہ"[1]۔ اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں منبر سے مراد صرف یہی منبر نہیں تھا جو مسجدوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ کرسی اور تخت کے معنی بھی اس سے لئے جاتے تھے، اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل بھی کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ صاحب اغانی نے بیان کیا ہے کہ جب حبابہ کا انتقال ہوا تو خلیفہ یزید بن عبدالملک کو اس کی موت کا اتنا رنج ہوا کہ وہ جنازے کے ساتھ جانے کے لئے نہ تو پیدل چل سکا اور نہ گھوڑے پر سوار ہو سکا۔ اسلئے لوگ اسے منبر پر بٹھا کر اپنے کندھوں پر لے گئے تھے[2]۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں منبر سے مراد مسجد کا منبر نہیں بلکہ تخت یا کرسی ہے۔ پھر ازرقی نے اپنی تاریخ مکہ میں بیان کیا ہے کہ امیر معاویہ اپنا منبر شام سے مکہ لائے تھے۔ اور وہی پہلا منبر تھا جو مکہ میں قایم کیا گیا[3]۔ قریب تر زمانے میں ابن الحاج نے لکھا ہے کہ مغرب میں دستور ہے کہ جب خطیب خطبہ سے فارغ ہو جاتا ہے تو منبر کو مکان کے اندر رکھ دیتے ہیں۔ اس دستور کو انہوں نے حجاج کی بدعت بتایا ہے[4]۔ لیکن درحقیقت یہ محض قدیم رواج کی پابندی ہے۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون (مطبوعہ بولاق) ص ۲۴۶، [2] فحمل علی منبر علی رقاب الرجال۔ اغانی ج ۱۳، ص ۱۵۸،

[3] ازرقی۔ ص ۳۳۳، [4] کتاب المدخل۔ ج ۲۔ ص ۷۸،

لیکن عربوں میں منبر کا استعمال کب سے شروع ہوا؟ اگر روایات پر یقین کر لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں سب سے پہلا شخص جو منبر یا سریر پر بیٹھا وہ ربیعہ بن مخاشن ذوالاعواد تھا۔ اور بعض مؤرخوں کے قول کے مطابق ربیعہ نہیں بلکہ اس کا باپ مخاشن[1] پہلا شخص تھا۔ بہرحال، ہمیں یہاں ربیعہ یا مخاشن سے غرض نہیں، غرض صرف اس سے ہے کہ عرب میں عہد قدیم ہی سے منبر کا رواج تھا اور اس پر بیٹھنے والے کو ذوالاعواد کہا گیا ہے۔ بظاہر یہ محض ایک خیالی شخص ہے جو ایک قبیلے میں حاکم[2] کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اسی طرح ہر قبیلے کے حکام کے نام ہمیں ملتے ہیں[3]۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ربیعہ بن مخاشن سے پہلے بھی حاکم ہوتے تھے، چنانچہ ایک مؤرخ نے الافعی بن الافعی الجرھمی کو پہلا حاکم بتایا ہے[4]۔ اعواد سے مراد یہاں منبر و عصا ہے۔ مخاشن سے پہلے عصا کا استعمال شروع ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ایک حاکم عامر بن النظرب العدوانی[5] تھا یہ شخص جب بہت بڈھا ہو گیا تو اس کے بیٹے نے کہا کہ تم بہت بڈھے ہو گئے ہو اور ممکن ہے کہ عدل میں غلطی کرتے ہو۔ اس پر عامر نے کہا کہ پھر کوئی ایسی نشانی ہونی چاہیئے کہ اگر میں غلطی کروں تو مجھے معلوم ہو جائے۔ اس نے اپنے بیٹے یا بیٹی سے کہا کہ ایک عصا لے کر بیٹھ جائے، اور جب وہ غلطی کرے تو عصا کھٹکھٹا دے تاکہ وہ متنبہ ہو جائے۔ اُسی وقت سے عرب میں "قرع العصا" ایک ضرب المثل بن گئی ہے جس کے معنے متنبہ کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ

---

[1] خطط ج ۲۔ ص ۲۴۰، اغانی ج ۳۔ ص ۳، یعقوبی ج ۱۔ ص ۲۹۹، [2] یاد رکھنا چاہیئے کہ حاکم کے معنے قاضی کے ہیں: الحاکم ھو القاضی، واصل الحکومۃ رد الرجل عن الظلم۔ الحکم القضاء بالعدل (لسان)، [3] تاج العروس تحت "حکم" یعقوبی ج ۱۔ ص ۲۹۹، ۳۰۰، [4] یعقوبی ج ۱۔ ص ۲۹۹، [5] عامر کے علاوہ دوسرے نام بھی لئے جاتے ہیں۔ لسان اور تاج۔ تحت قرع،

ایک شاعر کہتا ہے ؎

وزعمتم ان لاحلوم لنا + ان العصا قرعت لذی الحلم[1]

اور متلمس کا شعر ہے ؎

لذی الحلم قبل الیوم ما تقرع العصا + وما علّم الانسان الا لیعلما[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منبر و عصا دونوں تقریباً ساتھ ساتھ عربوں میں مروّج ہوئے تھے اور منبر عرب میں درحقیقت قاضی یا حاکم کے بیٹھنے کی جگہ تھی اور عصا ایک خاص مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر اس عصا سے مراد ہمیشہ قاضی ہی کا عصا لیا جاتا تھا۔ ہمیں ایک اور پرانی ضرب المثل بھی ملتی ہے انما القضاء جمرٌ فادفع الجمر بعودین۔ ان "عودین" سے مراد دو گواہ بھی لئے جاتے تھے۔ اور قاضی کی دو لکڑیاں، یعنی منبر و عصا بھی، جو قضا کی نشانیاں سمجھی جاتی تھیں[3]۔ اس کے علاوہ عصا کا ایک اور مصرف بھی تھا۔ تقریر کرتے وقت خطیب کے ہاتھ میں عصا یا قضیب ہوتا تھا اور وہ تقریر کرتے ہوئے اس عصا سے تال دیتا تھا۔ تاکہ تقریر (خطبہ) کی روانی اور موزونیت کو برقرار رکھے اور خطبہ بھی دیتا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آلات موسیقی کا رواج عرب میں نہیں ہوا تھا۔ ان آلات کے استعمال میں ایک ایرانی، سائب خاثر، کو عربوں کا استاد سمجھا جاتا ہے۔ اسی نے سب سے پہلے عرب میں عود بنایا تھا، اور عربوں کو عود بجانا سکھایا تھا، ورنہ اس سے قبل عصا (یا قضیب) سے تال دی جاتی تھی،

---

[1] الحماسة لابی تمام: الحارث بن وعلة الجرمی (باب الحماسة والشجاعة)۔ یہ مصرعہ مثل بن گیا تھا: المیدانی، مجمع الامثال، باب الالف، [2] لسان: تحت قرع، [3] فانہ اراد بالعودین الشاھدین۔ یرید اتق النار بھما واجعلھما جنتک ... وقیل اراد ثبت فی الحکم واجتھد فیھا ید فع عنک النار ما استطعت۔ لسان ج ۴۔ ص ۳۱۵،

اور گانے والا گاتا تھا[1]۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں عرب میں خطیب کے عصا سے تقریباً وہی کام لیا جاتا تھا۔ جو آج کل بینڈ ماسٹر کی چھڑی سے لیا جاتا ہے۔ خطیب یا تو خود ہی عصا کو منبر پر مارتا تھا۔ یا یہ کام بجائے اس کے کوئی دوسرا شخص انجام دیتا تھا۔ مغرب میں قدیم رسمیں مدتوں تک باقی رہی تھیں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں رسموں میں ایک رسم یہ بھی تھی۔ چنانچہ ابن الحاج نے اس طرف اشارہ کیا ہے، اور خطیب کو اس سے منع کیا ہے[2]۔ اس کے علاوہ عربی میں عصا کا لفظ ایک اور معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ عصا سے مراد اجتماع، ، اور اس کے انشقاق سے ایسا افتراق سمجھا جاتا تھا کہ جس کے بعد اجتماع ناممکن ہو۔ زمانۂ مابعد میں عصا سے مراد جماعت اسلام لی جانے لگی ، اور "شق العصا" سے مخالفت و افتراق جماعت اسلام[3]۔

اب سوال یہ ہے کہ عربوں کے حاکم یا قاضی کون اور کیسے لوگ ہوتے تھے؟ یہ لوگ سوائے عمائد اور خطباء کے کون ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ حاکم ایسے لوگ بنائے جاتے تھے۔ جو صاحب شرف وصدق ہوں، امانتدار اور صاحب ریاست ہوں، سن رسیدہ اور بزرگ وگرامی ہوں اور تجربہ رکھتے ہوں[4]۔

---

[1] ولم یکن یضرب بالعود انما کان یقرع بالعصا ویغنی مرتجلاً۔ اغانی ج ۷، ص ۱۲۹، گولڈزیہر ج ۱ ص ۱۶۹، صاحب اغانی ج ۱ ص ۱۱ نے موسیقی میں عصا کے استعمال کی ایک اور مثال دی ہے، فغناہ ابن سریج وبیدہ قضیب یوقع وینکت۔ [2] ویحذر ان یضرب بما فی یدہ علی درج المنبر بوجہین انہ لم یکن من فعل ما مضی والخیر کلہ فی الاتباع لہم وان المنبر ونعت والضرب علیہ علی الدوام مما یضربہ ویخلقہ۔ کتاب المدخل ج ۲ ص ۱۲۳، [3] قال ابو عبید واصل العصا الاجتماع والائتلاف ومنہ الحدیث ان الخوارج قد شقوا عصا المسلمین وفرقوا جماعتہم وشقوا اجتماعہم وائتلافہم۔ ومنہ حدیث صلۃ" ایاک وقتیل العصا" معناہ ایاک ان تکون قاتلاً او مقتولاً فی شق عصا المسلمین۔ وانشقت العصا: ای وقع الخلاف، العصا جماعۃ الاسلام والشق العصا: مخالفۃ جماعۃ اسلام۔ لسان ج ۱۹ ص ۲۹۶، [4] اہل الشرف والصدق والامانۃ والریاسۃ والسن والمجد والتجربۃ۔ یعقوبی ج ۱ ص ۲۹۹،

یہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ کہ قاضی اور خطیب کے لئے عصا اس لئے ضروری سمجھا جاتا تھا کہ وہ اس سے تال دے سکے، اور اپنی تقریر کو با اثر بنا سکے اور بوقت ضرورت اسے غلطی سے متنبہ کیا جا سکے۔ چنانچہ ارباب شعوبیہ عربوں پر طعن کرتے تھے کہ تم لوگ عصا کو تال دینے کے لئے استعمال کرتے ہو۔ اسکے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جب تک منبر ممالک اسلامیہ میں عام نہیں ہوا صوبوں کے شہروں کی جامع مسجدوں میں خطبہ عصا ہی کو ہاتھ میں لے کر دیا جاتا تھا اس کی تفصیل آگے آئے گی +

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ عرب میں منبر حبشہ سے لایا گیا تھا، اور اُسے حاکم یا قاضی کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ اور یہ بھی اندازہ ہو گیا۔ کہ حبشہ میں منبر کے ساتھ خواہ کیسے ہی خرق العادت تخیلات پائے جاتے ہوں عربوں میں آکر یہ تمام باتیں مفقود ہو گئیں۔ اور منبر محض ایک دنیوی چیز رہ گیا جو دنیوی کاموں کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ عربوں میں قاضی خاص خاص صفات کے حامل ہوتے تھے۔ یہی قاضی یا حاکم خطباء بھی ہوتے تھے۔ اور وہ عصا کو ایک خاص مقصد کے لئے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ اس قسم کے خطیبوں کا عہد نبوی میں بھی ذکر آتا ہے۔ چنانچہ اسلام لانے سے قبل بنی تمیم کا ایک وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس کے خطباء و شعراء کا مقابلہ دربار نبوی کے خطیبوں اور شاعروں سے ہوا تھا۔ آخر بنی تمیم نے یہ تسلیم کیا کہ آپ کے خطباء و شعراء ان کے آدمیوں سے بہتر ہیں، اور اس کے بعد یہ لوگ مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح ایک اور واقعہ ہے۔ کہ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کے بعد انصار آپ سے الگ ہو گئے

۱؎ گولڈزیہر۔ ج ۱۔ ص ۱۶۹، ۲؎ ابن ہشام۔ مطبوعہ یورپ۔ ج ۱۔ ص ۹۳۳، ۳؎ ابن ہشام (مطبوعہ یورپ) ج ۱۔ ص ۹۳۳،

قریش کو ان کا یہ طرزِ عمل بُرا معلوم ہُوا ۔ اور ان کے خطبا نے اس بارے میں خطبے دیئے ۔ حضرت عمرو بن العاص اور حضرت فضل بن عباس قریش کی طرف سے اس بحث میں شامل ہوئے اور آخر حضرت علیؓ نے اس تمام جھگڑے کو انصار کی تعریف کر کے ختم کیا ۔ حضرت علی کی بیعت کے بعد بھی جھگڑے شروع ہوئے تو انصار کے خطیب ، ثابت بن قیس بن شمّاس انصاری ، اور ایک اور انصاری نے خطبے دیئے[1] ۔ ان موقعوں پر یہ تفصیل نہیں ملتی کہ ان خطیبوں کے ہاتھ میں عصا تھا یا نہیں ۔ لیکن عرب کے دستور کے مطابق ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ خطبے بھی ضرور "علی العصی" ہی ہوئے ہوں گے ۔

(۲)

اگر ہم عہد اسلام پر غور کریں تو مکہ میں اسلام سے قبل منبر کا پتہ نہیں چلتا حالانکہ عبد المطلب ، ابو طالب اور ابن ہاشم بن عبد مناف کا شمار حکام عرب میں[2] تھا یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر قضایا کا فیصلہ کیا کرتے تھے ۔ اس کے بعد اگر ہم مدینہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت نبوی سے قبل وہاں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ انصار نے جمع ہو کر فیصلہ کیا تھا کہ جیسے یہودیوں نے یوم السبت اور نصاریٰ نے یوم الاحد اپنے اجتماع کے لئے مقرر کر لیا ہے ، ہم بھی یوم العروبہ کو اس کام کے لئے مخصوص کر لیں ۔ انہوں نے اس دن کا نام یوم العروبہ سے بدل کر یوم الجمعہ رکھ دیا تھا[3] ، جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تو آپ نے مدینہ کے قریب قبا میں قیام فرمایا ، اور اکثر مورخ اس پر متفق ہیں ۔ کہ وہیں آپ نے سب سے پہلی مسجد تعمیر فرمائی ۔ جیسے قرآن شریف میں

---

[1] یعقوبی ۔ ج ۲ ۔ ص ۱۴۳ ، ۲۰۷ ، [2] تاج ۔ تحت حکم ، [3] بیضاوی ، شہاب (حاشیہ بیضاوی) ، خازن ، فتح الباری ج ۲ ۔ ص ۴ ۔ ۲۹ ۔

مسجد اسس علی التقوی (سورۂ توبہ آیت ۱۰۹) کہا گیا ہے[۱]۔ تین دن تک آپ نے قبا میں قیام فرمایا۔ اور جمعہ کے دن آپ مدینہ میں داخل ہوئے۔ آپ نے بنو سالم بن عوف الخزرجی کی مسجد میں جو پہلے سے تیار تھی، جمعہ کی نماز پڑھی، اسلام میں پہلا جمعہ تھا[۲]۔ لیکن باوجود تلاش، اس جمعہ میں خطبے کا ذکر کہیں نہیں ملتا،

مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دینا شروع کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابھی منبر وجود میں نہیں آیا تھا۔ مسجد نبوی کی چھت کھجور کے تنوں پر قایم کی گئی تھی۔ اور انہیں تنوں میں سے ایک تنے کے ساتھ[۳] آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خطبہ کے دوران میں سہارا لیا کرتے تھے۔ یہ تنہ آپ کے مصلے کی داہنی جانب دیوار سے بالکل ملا ہوا تھا[۴]۔ جب منبر تیار ہوا تو وہ مصلی کی داہنی جانب ہی نصب کیا گیا۔ آٹھ برس اسی طرح گذر گئے اور اس کے بعد روایات سے منبر کے بنائے جانے کا پتہ چلتا ہے۔ منبر کے بنائے جانے کی تاریخ کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے۔ طبری اور یاقوت نے اسے ۷ھ کا، ابن اثیر نے ۸ھ کا، اور دیاربکری نے ۸ھ یا ۹ھ یا ۸ھ کا واقعہ بتایا ہے[۴]۔ لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عباس رض اس وقت مدینہ میں موجود تھے اور حضرت تمیم الداری نے منبر بنانے کی تجویز کی تھی۔ حضرت عباس فتح مکہ کے بعد مدینہ تشریف لائے ہیں، اور تمیم الداری کا مدینہ آنا ۹ھ کا واقعہ بتایا جاتا ہے[۵]۔ بہرحال عام اتفاق اس پر معلوم ہوتا ہے کہ منبر ۸ھ میں بنایا گیا تھا۔ یہ امر بھی

---

[۱] فتوح البلدان (مطبوعہ مصر) ص ۹ الخ، [۲] فتوح البلدان - ص ۱۲، [۳] دیاربکری ج ۲ ص ۶۸ الخ، سمہودی ج ۱ - ص ۲۷۴، وغیرہ، فتح الباری ج ۲ ص ۳۳۰، اسد الغابہ ج ۱ ص ۲۳،

[۴] طبری (مطبوعہ یورپ) ج ۱ ص ۱۵۹۱، معجم البلدان (مطبوعہ یورپ) ج ۳ ص ۷۶۷، اسد الغابہ ج ۱ ص ۲۳، دیاربکری ج ۲ ص ۶۸، فتح الباری ج ۲ - ص ۳۳۰، [۵] فتح الباری ج ۲ ص ۳۳۰، سمہودی ج ۱ ص ۲۸۰،

قابل لحاظ ہے کہ جب آپ کے سامنے منبر کی تجویز پیش ہوئی تھی۔ تو آپ نے صحابہ سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ اور اسی مشورہ کی بنا پر منبر بنایا گیا[1]۔ اب اگر ۸ھ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سے کچھ ہی عرصہ قبل آپ نے بیرونی بادشاہوں کو خطوط لکھے ہیں۔ جن سے اسلام کا نام عرب سے باہر پہنچا ہے پھر ۸ھ میں مکہ فتح ہوا۔ جس کے معنے یہ تھے کہ اب درحقیقت تمام عرب آپ کے قدموں کے نیچے تھا۔ اور مشرکین کی مزاحمت کی تمام قوتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اب ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں رہا تھا کہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں۔ چنانچہ اسی زمانے میں آپ کے پاس مختلف قبائل کے وفد آنے شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ ۹ھ کو عام الوفود کہا جاتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی عمر گرامی اس وقت ساٹھ برس کی ہو چکی تھی۔ بعض مرتبہ آپ دوران خطبہ میں کھڑے کھڑے تھک جاتے تھے آپ کا بدن بھاری ہو گیا تھا۔ اور پیر میں تکلیف بھی تھی۔ آپ نے ایک مرتبہ خود شکایت کی تھی کہ "ان القیام قد شق علیّ"۔ اس لئے اور بھی ضروری تھا۔ کہ آپ کے لئے کوئی ایسی چیز بنائی جائے کہ جس پر آرام فرمانے کے لئے بیٹھ سکیں[2]۔ اس کے علاوہ فتح مکہ کے بعد خالد بن ولید اور حضرت عمار بن یاسر میں ایک جنگ کے دوران میں جھگڑا ہو گیا تھا، اور ان حضرات کے قضیئے کا فیصلہ آپ نے فرمایا تھا۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی تھی : یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم، فان تنازعتم

---

[1] سمہودی ج ۱ ص ۲۷۸، [2] فتح الباری ج ۲ ص ۳۳۰، سمہودی ج ۱ ص ۲۷۵، ۲۷۷، ۲۷۸،

حضرت تمیم الداری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کو منبر کا علم ہی نہیں تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے یہ تجویز پیش کی ہے تو آپ نے پوچھا تھا: "وکیف المنبر؟" سمہودی ج ۱ ص ۲۷۷،

فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر ذلک خیر واحسن تاویلا (سورۂ نسا۔ آیت ۶۲)[1]

منبر بنائے جانے کے متعلق تین روایتیں ہیں۔ اول تو کہا جاتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا بنایا جانا تجویز کیا تھا[2]۔ دوسرے یہ کہ ایک اجنبی نے، جسے رومی کہا جاتا ہے۔ آپ کو کھڑے ہوکر خطبہ دیتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا کہ وہ آپ کے لئے منبر بنا سکتا ہے[3]، تیسری روایت یہ ہے کہ حضرت تمیم الداری نے، جو عام طور پر فلسطین میں رہتے تھے۔ یا اکثر فلسطین آتے جاتے رہتے تھے، عرض کیا کہ وہ آپ کے لئے ایسا ہی منبر بنا سکتے ہیں جیسا کہ انہوں نے شام میں دیکھا ہے[4]۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس رومی کا ذکر بعض روایات میں پایا جاتا ہے وہ خود حضرت تمیم الداری ہی ہوں۔ اور انہیں اس وجہ سے رومی کہہ دیا گیا ہو کہ وہ اکثر شام میں رہتے تھے[5]۔ یہاں یہ کہنا کہ حضرت تمیم الداری نے عرض کیا کہ وہ ایسا منبر تیار کردیں جیسا کہ انہوں نے شام میں دیکھا تھا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم منبر سے لاعلم تھے۔ یا کم از کم حجاز میں لوگ منبر سے واقف نہ تھے، اور جب منبر نبوی تیار ہوا ہے۔ تو وہاں کے لوگوں کے لئے وہ بالکل نئی چیز تھی۔

اب یہ سوال ہے کہ سب سے پہلا منبر کس نے بنایا اور وہ کس لکڑی کا تھا؟ اس پر تو سب کو اتفاق ہے کہ اس کی لکڑی غابہ سے لائی گئی تھی۔ جو شام کے راستے پر مدینہ سے ایک منزل کے فاصلے پر ہے۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ

---

[1] تفسیر خازن، اور تفسیر ابن کثیر، [2] ارشاد الساری ج ۲ ص ۱۷۱، [3] سمہودی ج ۱ ص ۲۷۵، [4] سمہودی ج ۱ ص ۲۷۸، فتح الباری ج ۲ ص ۳۳۰،

[5] فتح الباری ج ۲ ص ۳۳۰،

یہ لکڑی اثل تھی اور بعض کا بیان ہے طرفاء[1] تھی۔ یہاں ہم حضرت سہل بن سعد کی روایت پر انحصار کرتے ہیں۔ جن کا انتقال ۸۸ھ میں ہوا[2]، اور جو خود نصب منبر کے وقت موجود تھے۔ ان کا بیان ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری بی بی سے، جن کا نام انہوں نے نہیں لیا[3]، فرمایا کہ اپنے غلام کو جو بڑھئی تھا، حکم دیں کہ وہ آپ کے لئے ایک منبر تیار کر دے۔ تاکہ آپ اس پر بیٹھ سکیں۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور منبر تیار ہو گیا۔ منبر بنانے والے بڑھئی کے نام میں بہت کچھ اختلاف ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس وقت مدینہ میں صرف ایک بڑھئی میمون نامی تھا۔ لیکن اس کے علاوہ چھ اور کاریگروں کے نام بھی لئے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک باقول یا باقوم بھی تھا۔ جس نے قریش کے لئے کعبہ تعمیر کیا تھا[4]۔ اور قومیت کے لحاظ سے رومی تھا۔ ایک اور شخص صباح تھا، چوتھا قبیصۃ المخزومی یا نصیبۃ المخزومی تھا۔ پانچواں حضرت عباس کے غلام، کلاب، چھٹے صاحب خود حضرت تمیم الداری ہیں، جنہوں نے منبر بنانا تجویز کیا تھا۔ اور ساتواں شخص انہیں انصاریہ کا غلام "مینا" تھا۔ امام ابن حجر عسقلانی ان میں سے میمون کو سب پر ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ ممکن ہے کہ مدینہ میں ماہر بڑھئی صرف میمون ہوں اور ان باقی کاریگروں سے

---

[1] یاقوت۔ مطبوعہ مصر۔ تحت غابہ، لکڑی کے متعلق دیکھو فتح الباری ج ۲ ص ۳۳۰، دیار بکری ج ۲ ص ۶۹، لسان۔ تحت اثل۔ سمہودی ج ۱۔ ص ۲۷۷۔ وکان المنبر من اثالۃ کانت قریبًا من المسجد۔ لیکن اثل اور طرفا ایک ہی لکڑی کے دو نام ہیں۔ فان الاثل ھو الطرفاء وقیل یشبہ الطرفاء۔ فتح الباری ج ۲ ص ۳۳۰، [2] تاریخ صغیر۔ امام بخاری۔ مطبوعہ دہلی ص ۹۰، [3] گو حضرت سہل نے ان بی بی کا نام نہیں بتایا۔ لیکن اس کے متعلق بہت سے قیاسات ہیں جو بالکل بے نتیجہ ہیں۔ ارشاد الساری ج ۲ ص ۱۸۱، سمہودی ج ۱۔ ص ۲۷۸، [4] دیار بکری ج ۲ ص ۶۸، سمہودی ج ۱۔ ص ۲۸۰،

منبر بنانے میں ان کی مدد کی ہو۔ اس وجہ سے ان سب کے نام محفوظ رہ گئے[1]

منبر جب تیار ہؤا ہے تو اس کے تین درجے تھے۔ دوسرے درجہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیئے کھڑے ہوتے تھے اور تیسرے درجے پر بیٹھتے تھے[2]۔ اس کے بعد حضرت عثمان نے پہلی مرتبہ منبر پر قبطی یا قطیفہ کپڑے کا غلاف چڑھایا[3]۔ امیر معاویہ نے اپنے عہد خلافت میں منبر نبوی کو شام میں منتقل کرنا چاہا، اور ان کے حاکم مدینہ، مروان بن الحکم، نے اسے اپنی جگہ سے اکھاڑ بھی لیا۔ مگر لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے وہ اُسے شام بھیجنے سے باز رہا۔ اور یہ بہانہ کیا۔ کہ خلیفہ نے اُسے حکم دیا ہے کہ اُسے اور بلند کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے اور چھ درجوں کا اضافہ کیا۔ خلیفہ مہدی عباسی تک وہ اسی حالت میں رہا اس خلیفہ نے سنہ ۱۶۱ھ میں حج کیا، اور ارادہ کیا کہ منبر کو پھر اصلی حالت پر لے آئے، اور تین درجے کر دے۔ لیکن حضرت امام مالک بن انس نے کہا کہ "یہ طرفاء کا بنا ہؤا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ اگر اسے ہلایا گیا تو بالکل فنا ہو جائے گا"۔ اسلیئے مہدی اپنے ارادے سے باز رہا۔ اور اس کی صرف مرمّت کرا دی۔ اس کے بعد بھی اس کی مرمّت ہی ہوتی رہی اور کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ یہاں تک کہ سنہ ۶۵۴ھ میں مسجد نبوی آگ کی نذر ہو گئی۔ اس میں یہ منبر بھی جل گیا۔ دو سال بعد سنہ ۶۵۶ھ میں المظفر حاکم یمن نے ایک منبر وہاں بھیجا۔ دس یا بیس برس تک یہ منبر کام آتا رہا۔

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۳۳۰، اس کے علاوہ دیکھو ارشاد الساری ج ۲ ص ۱۸۱، سمہودی ج ۱ ص ۲۷۷ الخ، دیار بکری ج ۲ ص ۶۸۷، [2] سمہودی ج ۱ ص ۲۷۵۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس منبر کے چار درجے تھے: فی روایۃ الدارمی ھذہ المراقی الثلاث والاربع علی الشک، وفی صحیح مسلم ھذہ الثلاث درجات من غیر شک ایضاً ص ۲۸۳ الخ۔ دیار بکری ج ۲ ص ۶۸، [3] سمہودی ج ۱ ص ۲۸۲، ارشاد الساری ج ۲ ص ۱۸۱، دیار بکری ج ۲ ص ۶۸، قبطیہ اور قطیفہ دونوں ایک ہی کپڑے کے نام معلوم ہوتے ہیں ؎

پھر مصر کے سلطان بیبرس نے ایک نیا منبر بھیجا۔ جسے المظفر کے منبر کی جگہ نصب کیا گیا اور جو امام ابن حجر عسقلانی کے زمانے تک موجود تھا۔ پھر ملک المؤید نے ۸۲۰ھ میں ایک دوسرا منبر بھیجا تھا[۱]۔

جب تک منبر تیار نہیں ہؤا، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایک کھجور کے تنے کے سہارے خطبہ دیتے رہے، دوران خطبہ میں آپ کے بیٹھنے کا ذکر نہیں آتا۔ صرف اس کا پتہ چلتا ہے کہ جب آپ تھک جاتے تھے تو اسی تنے سے تکیہ لگا لیتے تھے۔ لیکن جب آپ کمزور ہو گئے، اور دیر تک کھڑے رہنے سے تکلیف محسوس ہونے لگی تو زیادہ آرام لینے کی ضرورت ہوئی، منبر بنانے کی بڑی وجہ، اور غالباً سب سے بڑی وجہ، یہی تھی۔ کہ آپ دوران خطبہ میں آرام لے سکیں۔ چنانچہ اس کے بعد متواتر روایات ملتی ہیں۔ کہ آپ خطبہ دیتے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے لئے خاموش بیٹھ جاتے تھے۔ اور پھر کھڑے ہو کر خطبہ ختم کرتے تھے۔ جیسا کہ آج تک عمل ہوتا ہے[۲]۔ اور یہ روایت کہ آپ بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے جھوٹ ہے[۳]۔ چنانچہ آیت مبارک واذا رأوا تجارۃ او لھوا انفضوا الیھا وترکوک قائما (سورہ جمعہ آیت ۱۱) کی تفسیر میں مفسرین متفق ہیں کہ "ترکوک قائما" سے مراد یہ ہے کہ لوگوں نے آپ کو

---

[۱] فتح الباری ج ۲ ص ۳۳۱، سمہودی ج ۱ ص ۲۸۴ لغ۔ اس کتاب میں منبر نبوی کی پوری تفصیل ملیگی، دیار بکری ج ۲۔ ص ۶۸، ۶۹، [۲] فتح الباری ج ۲ ص ۳۳۲؛ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب قائما ثم یقعد ثم یقوم کما تفعلون الآن، سنن نسائی ج ۱ ص ۲۰۹، ترمذی ج ۱ ص ۱۰۱، کان یخطب یوم الجمعۃ ثم یجلس ثم یقوم فیخطب مثل ما تفعلون الیوم۔ ابن ماجہ ص ۷۹، [۳] فمن حدثکم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یخطب قاعداً فقد کذب۔ نسائی ج ۱ ص ۲۰۹، فتح الباری ج ۲۔ ص ۳۳۳،

منبر پر کھڑا چھوڑ دیا تھا[1]۔ ایک مرتبہ حضرت کعب بن عجرہ نے عبد الرحمن بن ام[2] الحکم کو دیکھا کہ وہ بیٹھ کر خطبہ دے رہے ہیں۔ انہیں عبد الرحمن کا یہ فعل بہت ناگوار گذرا اور آپ نے یہی آیت تلاوت[3] فرمائی۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بھی کھڑے ہو کر خطبہ دیتے رہے۔ آخر حضرت عثمان کا زمانہ آیا۔ اس وقت آپ کی عمر ستر برس کی تھی، آپ خطبہ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تھے اور بیچ میں تھوڑی دیر خاموش بیٹھ کر پھر کھڑے ہوتے اور خطبہ ختم کرتے۔

ابن الحاج نے لکھا ہے کہ جب امام منبر پر آئے تو اسے چاہیئے کہ اپنے ہاتھ میں تلوار یا عصا یا کوئی ایسی ہی چیز رکھے[4]۔ یہ بھی قدیم دستور رہا اور خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ جنگ کے موقع پر خطبہ دیتے وقت آپ کے ہاتھ میں کمان ہوتی تھی اور جمعہ کے خطبے میں عصا[5]

---

[1] مثلاً طبری، بغوی، ابن کثیر، بیضاوی، [2] فتح الباری (ج ۲ص ۳۳۳) میں ابی الحکم، اور سنن نسائی میں ام الحکم ہے (ج ۱۔ص ۲۰۷) یہی درست بھی ہے۔ ام الحکم حضرت امیر معاویہ کی بہن تھیں۔ عبد الرحمن بن ام الحکم اپنی ماں کی طرف منسوب ہیں۔ اصلی نام عبد الرحمن بن عبد اللہ بن عثمان بن عبد اللہ بن ربیعہ الثقفی تھا، کوفہ اور مصر کے حاکم رہے تھے دیکھو سیوطی: حسن المحاضرہ ج ۲ص ۶، [3] فتح الباری ج ۲ص ۳۳۲، نسائی ج ۱ص ۲۰۷، عن کعب بن عجرۃ انہ دخل المسجد وعبد الرحمٰن بن ام الحکم یخطب جالسًا قال: انظروا الی ھذا الخبیث یخطب جالسًا وقد قال اللہ تعالیٰ واذا رأوا تجارۃ۔ الخ، منقول از خازن۔ صحیح مسلم، ج ۱ص ۳۱۹، [4] المدخل ج ۲ ص ۱۲۲،

[5] اذا خطب فی الحرب خطب علی قوس واذا خطب فی الجمعۃ خطب علی العصا ابن ماجہ (مطبوعہ دہلی) ص ۷۹، آپ کے متعدد عصا تھے، چنانچہ عبد الملک نے آپ کا ایک عصا عہدامان کے طور پر زفر بن حارث کے پاس بھیجا تھا (ابن اثیر ج ۴۔ حوادث ۷۱ھ) ان کے نام دیار بکری (ج ۲ص ۱۸۹) نے لکھے ہیں ان میں سے ایک عصا کا نام ممشوق تھا۔ بکر (ج ۱ص ۷۰۰) نے عجیب وغریب غلط بیانی سے کام لیا ہے (باقی بر ص ۵۲)

اسی طرح ایک اور روایت ہے کہ خطبۂ جمعہ میں بھی قوس آپ کے ہاتھ میں ہوتی تھی یہ روایت اس وجہ سے مشتبہ ہو جاتی ہے کہ اس کے راوی، الحکم بن حزن الکلفی نے بیان کیا ہے کہ: فقال متوکئا علی عصا او قوس[۱]۔ لیکن عید کے موقع پر کمان ہاتھ میں لے کر آپ کا خطبہ دینا صراحت سے بیان کیا گیا ہے[۲]۔ بہرحال آنحضرت[ص] کا عصا اور منبر لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ اور اسی وجہ سے "العودان" سے مطلب منبر نبوی اور عصا لیا جاتا ہے[۳]۔ حضرت امیر معاویہ نے جب منبر نبوی دمشق میں منتقل کرنا چاہا تو منبر کے ساتھ عصا کو بھی منگوانا چاہا تھا[۴]۔ بعد کے زمانے میں خطیب کے لئے بھی عصا کا ہاتھ میں رکھنا لابدی سمجھا جانے لگا تھا چنانچہ [illegible] نے ایک جگہ جاحظ کا قول نقل کیا ہے کہ: مجھے اس سے غرض نہیں کہ خطیب ننگا ہے یا کپڑے پہن کر آیا ہے۔ لیکن عصا اور عمامہ اس کے پاس ضرور ہونا چاہیئے[۵]۔ امام غزالی نے عصا اور کمان کے ساتھ نیزے اور تلوار کو بھی شامل کر لیا ہے[۶] ظاہر ہے کہ نیزے اور عصا میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ اور تلوار ہمیشہ اقتدار و اختیار کی نشانی سمجھی جاتی رہی ہے۔ عہد اسلامی میں بھی اس کی یہ حیثیت باقی تھی - اور

(بقیہ ص ۵۱) وہ لکھتا ہے کہ آپ کے عصا میں یہ اثر تو نہیں تھا کہ چٹان سے پانی نکال سکے۔ لیکن اس کے اشارے سے پتھر کے بت نیچے گر پڑے تھے۔ اس نے یعقوبی ج ۲ ص ۷۰ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں مشوق نام عصا تھا۔ مگر یعقوبی نے صرف اتنا ذکر کیا ہے کہ آپ کے ایک عصا کا نام مشوق تھا اور بس، اس نے یہ بھی نہیں لکھا کہ کعبہ میں داخل ہونے کے وقت یہی خاص عصا آپ کے ہاتھ میں تھا۔ معلوم نہیں بکر نے یہ نتیجہ کس طرح نکال لیا۔ یہ جرمن مستشرق یا تو اسلام اور تاریخ اسلام کو سمجھا ہی نہیں۔ یا جان بوجھ کر غلط بیانی کرتا ہے۔ بہرحال اس کی کتاب اس قسم کے سینکڑوں خرافات سے پر ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] سنن ابو داؤد (برحاشیہ موطا مطبوعہ مصر) ج ۱ ص ۳۰۲، [۲] سنن ابو داؤد ج ۱ ص ۳۱۴، [۳] لسان، محیط المحیط۔ تحت عود، [۴] طبری (مطبوعہ یورپ) ج ۲ ص ۹۲، [۵] منقول از بکر ج ۲ ص ۴۵۶، [۶] احیاء العلوم ج ۱ ص ۱۴۲،

صاحب الحرس کے ہاتھ میں ہمیشہ تلوار رہتی تھی۔ اگر تلوار اس سے لے لی جائے تو وہ اپنے عہدے سے معزول سمجھا جاتا۔ چنانچہ بنی امیہ کے عہد کے ایک واقعہ سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے[۱]۔ یہی طریقہ آج کل بھی رائج ہے ؛

(۳)

حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد منبر کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ ہمسایہ سلطنتوں میں جن سے اب مسلمانوں کے تعلقات پیدا ہوئے۔ یہ دستور تھا کہ فرمانروا اپنی رعایا سے بلند ہو کر تخت پر بیٹھتا تھا۔ عہدِ جاہلیت کے عربوں میں منبر کی اس حیثیت کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں کہ وہ حکام کے بیٹھنے کی جگہ تصوّر کیا جاتا تھا۔ حجاز میں عام طور پر لوگ اس سے ناواقف تھے۔ لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات تک عرب کا پرانا انتشار و افتراق ختم ہو چکا تھا اور ایک علاقہ دوسرے علاقے کی روایات سے ضرور واقف ہو چکا ہوگا۔ اس لئے آپ کے وصال کے بعد ایک طرف تو یہ ضروری ہُوا کہ ہمسایہ سلطنتوں کی طرح مسلمان بھی اپنے حکمران کو کچھ نہ کچھ فوقیت دیں، خواہ وہ فوقیت کتنی ہی خفیف کیوں نہ ہو۔ اور دوسری طرف منبر کی قدیم روایات موجود ہی تھیں۔ اس لئے منبر کو اب حکمران کی نشست گاہ قرار دے دیا گیا ؛

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات پر مسلمانوں میں سب سے پہلے سقیفۂ بنوساعدہ کا قضیہ پیش آیا۔ اس پرآشوب واقعہ کا خاتمہ اس طرح ہُوا کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں پیش قدمی کی حضرت ابوعبیدۃ الجراحؓ نے

---

[۱] سیوطی۔ تاریخ الخلفاء۔ ص ۲۴۱۔ یہاں حضرت عمر بن عبدالعزیز، اور خلیفہ سلیمان کے صاحب الحرس، خالد کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا۔ کہ تلوار اقتدار و اختیار کی کہاں تک نشانی سمجھی جاتی تھی ،

آپ کی پیروی کی۔ اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے دوسرے دن صبح کو حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے منبر پر بیٹھے۔ حضرت عمرؓ نے ایک تقریر کی، اور وہیں منبر پر بیعت العامہ منعقد ہوئی۔[1] یہی کیفیت ہمیں حضرت ابوبکرؓ کی وفات پر نظر آتی ہے، اور ان کے تینوں جانشینوں کے وقت بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔[2] حضرت عمر کی وفات پر جب خود مجلس شوریٰ کے اراکین میں تنازعات شروع ہوئے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے منبر ہی کے سامنے کھڑے ہو کر دعوئے خلافت سے دست برداری کا اعلان کیا۔[3] حضرت عثمانؓ سے بیعت بھی اسی طرح کی گئی۔ کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی جگہ بیٹھے تھے۔ اور حضرت عثمانؓ نے دوسرے درجے پر بیٹھ کر لوگوں سے بیعت لی تھی۔[4] یہاں تک تو بیعت منعقد کئے جانے کا تعلق تھا مگر خلافت سے دست برداری کے موقع پر بھی اس کا اعلان منبر پر ہی ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت امام حسنؓ نے جب خلافت سے دست بردار ہونے اور امیر معاویہ سے صلح کرنے کا ارادہ کیا ہے تو اس کا اعلان بھی آپ نے منبر پر ہی سے کیا تھا۔[5]

---

[1] ارشاد الساری: وکانت البیعۃ علی المنبر۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۰۱۷، طبری ج ۱ ص ۱۲۲۸

[2] طبری۔ ج ۱ ص ۲۱۴، ۲۸۰۰، ۳۰۶۸، [3] طبری ج ۱۔ ص ۲۷۹۲،

[4] ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ سے ایک درجہ نیچے اور حضرت عمرؓ پھر اس سے بھی ایک درجہ نیچے کھڑے ہوتے تھے۔ خلفاء میں سب سے پہلے حضرت عثمانؓ ہیں جو آپ کی جگہ پر بیٹھے تھے۔ فصعد عثمان المنبر فجلس فی الموضع الذی کان یجلس فیہ رسول اللہ ولم یجلس ابوبکر ولا عمر فیہ جلس ابوبکر دونہ بمرقاۃ وجلس عمر دون ابوبکر بمرقاۃ۔ فتکلم الناس فی ذلک وقال بعضھم الیوم ولد الشر۔ یعقوبی ج ۲ ص ۱۷۸۔ اس کے علاوہ دیکھو صفحہ ۱۴۲، ۱۵۷، دیار بکری نے لکھا ہے حضرت عثمانؓ اپنی خلافت کے پہلے چھ برس حضرت عمرؓ کی طرح دوسرے درجے پر کھڑے ہوا کرتے تھے اور پھر علا الی موضع النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ ج ۲ ص ۲۶۵، یہی روایت سمہودی میں بھی پائی جاتی ہے ج ۱ ص ۲۸۲، [5] یعقوبی ج ۲ ص ۲۵۶،

ایک اور واقعے کا ذکر کرنا بھی یہاں بے موقع نہیں ہے۔ جس سے ظاہر ہوگا۔ کہ اس زمانے میں منبر کو کوئی مذہبی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ وہ صرف خلیفہ کی نشستگاہ تھی۔ جس پر سے وہ خطبہ دیتا تھا۔ اور جس پر بیٹھ کر سیاسی اور فوجی معاملات میں لوگوں سے مشورہ کرتا تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمارؓ بن یاسر ایک خط ایران سے حضرت عمرؓ کے پاس لائے۔ جس میں فتح جلولا کی خوشخبری تھی اور یہ بھی ذکر تھا کہ یزدجرد ہر طرف سے فوجیں جمع کر رہا ہے۔ اس کے بعد جنگ نہاوند پیش آئی۔ یہ خط لئے ہوئے حضرت عمرؓ منبر پر آئے (فصعد المنبر) اور لوگوں سے مشورہ کیا۔ حاضرین نے اس معاملے کے متعلق مخالف اور موافق رائیں دیں[1]؛

مسجد نبوی کے بعد دنیا میں سب سے پہلا جمعہ بحرین کے ایک قریہ "جواثا (یا جواثی)" میں مسجد عبدالقیس میں پڑھا گیا[2]۔ یہ حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا، اور خود آپ نے اہل بحرین کو لکھا تھا کہ "حسب دستور" تم جمعہ کی نماز پڑھتے رہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے، اور بصراحت بھی بیان ہوا ہے۔ کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ایسا کیا کرتے تھے۔ وحی کا نزول بند نہیں ہوا تھا، اور اگر یہ بات خلاف قاعدہ ہوتی تو آپ خود ہی اسے منع فرما دیتے۔ پھر جب حضرت عمرؓ نے اجازت کی تجدید کی تو اس زمانے میں صحابہ موجود تھے۔ جو سنت سے ذرا سا انحراف بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے[3]۔ اس کے بعد حضرت لیث بن سعد سے روایت کی گئی ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں مصر اور اس کے ساحل کے رہنے والے، جن میں صحابہ بھی شامل تھے۔ جمعہ کی نماز پڑھا کرتے تھے[4]۔ غرض یہ تو عہد راشدہ کا حال ہے

---

[1] دینوری۔ مطبوعہ یورپ ص ۱۴۱، [2] سنن ابو داؤد۔ موطاء کے حاشیہ پر (مطبوعہ مصر) ج ا ص ۲۹۶، ارشاد الساری ج ۲ ص ۱۵۸، فتح الباری ج ۲ ص ۳۱۶، [3] فتح الباری ج ۲ ص ۳۱۶، ارشاد الساری ج ۲ ص ۱۵۸،

[4] فتح الباری ج ۲ ص ۳۱۶،

کہ خلیفہ کی اجازت سے نماز جمعہ صوبجات میں پڑھی جا رہی ہے۔ عہد اموی میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی طرف سے رُزیق بن حکیم ایلہ کے والی تھے۔ جہاں حبشیوں اور دیگر مسلمانوں کی ایک جماعت رہتی تھی۔ انہوں نے ابن شہاب الزہری کو لکھا کہ کیا وہ جمعہ کی نماز پڑھ سکتے ہیں، اور امام زہری نے انہیں اس کی اجازت دی، چنانچہ اسی اجازت کی بنا پر خلیفہ (امام) کی مزید اجازت کے بغیر نماز جمعہ شروع ہو گئی[۱]۔ یہ حال تو نماز جمعہ کا تھا۔ لیکن منبر کی کیفیت اس سے بالکل جداگانہ تھی،

صوبجات کے منبروں کے بارے میں سب سے زیادہ تفصیل مصر کے متعلق ملتی ہے، اور اسی پر اور صوبوں کی حالت بھی قیاس کی جا سکتی ہے۔ مسجد نبوی کے بعد باقاعدہ تعمیر شدہ مساجد میں غالباً دنیا کی سب سے زیادہ قدیم مسجد وہ تھی جو حضرت عمرو بن العاص نے ۲۱ھ[۲] میں فسطاط میں بنائی تھی۔ اس مسجد میں انہوں نے ایک منبر بھی نصب کرایا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے اسے توڑ دینے پر اصرار کیا اور لکھا کہ "کیا تو اسے کافی نہیں سمجھتا کہ تو کھڑا ہوتا ہے اور مسلمان تیرے قدموں میں بیٹھتے ہیں[۳]؟" حکم کی تعمیل کی گئی اور فسطاط کا منبر توڑ ڈالا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ حاکم صوبہ کے کھڑے ہونے اور اس طرح دیگر مسلمانوں پر مرجح سمجھے جانے ہی کو قابلِ اعتراض سمجھتے تھے۔ منبر پر بیٹھنے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ صرف ایک منبر خلیفہ کے لئے مدینہ میں ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد اواخر عہد اموی تک کم از کم مصر میں فسطاط کے باہر کوروں اور شہروں میں منبر قائم نہیں ہوا۔ اب اگر اسی صورت حال پر قیاس کیا جائے

---

[۱] فتح الباری ج ۲۔ ص ۳۱۶۔ ارشاد الساری ج ۲ ص ۱۵۸، ۱۵۹، [۲] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۷۵، [۳] اما یحسبک ان تقوم قائماً والمسلمون تحت عقبیک۔ ابن تغری بردی ج ۱ ص ۷۶، حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۶۳،

تو دوسرے صوبوں میں بھی کوئی منبر قائم نہیں ہونا چاہیئے۔ اور غالباً قایم بھی نہیں ہُوا صرف تین روایات ایسی ملتی ہیں جو اس طرزِ عمل کے منافی ہیں۔ حریری نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے کوفہ کے منبر پر سے لوگوں کو مخاطب کیا تھا[1]۔ حضرت علیؓ نے کوفہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا تھا۔ اور وہ وہاں اپنا منبر بھی قایم کر سکتے تھے۔ لیکن اس منبر کے قائم ہونے کا حال ہمیں کہیں نہیں مل سکا۔ اور نہ یہ پتہ لگ سکا کہ آپ کی تشریف آوری سے قبل کوفہ میں کوئی منبر تھا بھی یا نہیں۔ اس قسم کا ایک دوسرا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت عثمان شہید ہوئے تو آپ کی بیوی حضرت نائلہ نے آپ کے خون آلودہ کپڑے اور اپنی دو کٹی ہوئی انگلیاں حضرت معاویہ کے پاس شام بھیجی تھیں اور انھوں نے یہ چیزیں منبر پر رکھی تھیں[2]۔ ہمیں یہ پتہ نہیں چلا کہ یہ منبر کہاں سے آیا، کب بنایا گیا اور آیا خلیفہ کی اجازت سے بنایا گیا تھا یا بلا اجازت، اغلب یہ ہے۔ کہ اس موقع پر شام میں منبر کا ذکر قبل از وقت ہے، اور مصر کی طرح وہاں بھی اس وقت منبر کا وجود نہیں تھا۔ اسی زمانے کا ایک اور واقعہ سیوطی نے بیان کیا ہے کہ جب حضرت علیؓ نے قیس بن سعد کو مصر کا حاکم مقرر کیا ہے تو وہ سات آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچے۔ اور منبر پر کھڑے ہوئے تھے (فرقی المنبر[3]) شام کی طرح یہاں مصر میں بھی منبر کا ذکر قبل از وقت ہی معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال ان سوالات کا جواب دینا فی الحال ناممکن ہے ؎

(۴)

اگر خلافت راشدہ سے گذر کر عہد اموی کا مطالعہ کیا جائے۔ تو حالات

---

[1] درۃ الغواص (مطبوعہ یورپ ۱۸۷۱ء) ص ۱۳۳، [2] طبری ج ۱۔ ص ۳۲۵۵،

[3] حسن المحاضرہ ج ۲۔ ص ۴،

بالکل بدلے ہوئے نظر آتے ہیں، اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خلفائے بنی امیہ منبر کو حقیقۃً تختِ شاہی کے مترادف سمجھنے لگے تھے۔ اس کے لئے اُن کے سامنے قدیم ساسانی اور بازنطینی سلطنتوں کی روایات بطور نمونہ موجود تھیں چنانچہ گولڈزیہر نے لکھا ہے کہ بنی امیہ کے خلفاء اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ جماعت کے امام اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انہیں منبر پر بیٹھنا چاہیے۔ انہیں اس کا بھی احساس تھا۔ کہ دنیائے اسلام کا اصل منبر وہ نہیں جو کوئی حاکم وقت اپنے لئے تیار کرا کے مسجد میں رکھ لے۔ بلکہ حقیقی منبر مدینہ کا منبر نبوی ہے اسی وجہ سے ان خلفاء نے متعدد مرتبہ یکے بعد دیگرے کوشش کی کہ منبر نبوی کو دمشق میں منتقل کرا لیا جائے۔ سب سے پہلے امیر معاویہ نے سنہ ۵۰ھ میں اس منبر کو دمشق لانا چاہا۔ لیکن سورج کو گرہن لگ گیا، اور حضرت ابوہریرہ نے انہیں اس سے باز رکھا۔ اس کے بعد عبدالملک نے یہی ارادہ کیا، اور قبیصہ کے کہنے سے باز آیا۔ پھر ولید نے اپنے زمانے میں بنی امیہ کے اس پرانے ارادے کی تکمیل کرنی چاہی، اور سعید بن المسیب کے کہنے سے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اُسے اس خیال سے باز رکھا۔ جب سلیمان بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اُسے بھی لوگوں نے اُبھارا کہ منبر نبوی کو دمشق میں منتقل کرلے۔ اُس نے صرف یہی نہیں کہ اس طرف توجہ نہیں کی بلکہ کہا کہ "میں یہ سننا بھی نہیں چاہتا کہ عبدالملک اور ولید نے ایسا ارادہ بھی کیا تھا"[1]

جب امیر معاویہ منبر نبوی کو دمشق میں منتقل نہ کر سکے تو سنہ ۴۴ھ[2] میں وہ حج کرنے گئے تو شام سے اپنا منبر ساتھ لے گئے۔ جس کے تین درجے تھے۔ یہاں بھی وہ خیال کام کرتا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفۂ جماعت کے لئے منبر کا ہونا ضروری ہے

---

[1] سمہودی ج ۱ ص ۲۸۲، طبری ج ۲ ص ۹۲، [2] یعقوبی ج ۲ ص ۲۵۶،

یہ پہلا منبر تھا جو مکہ پہنچا۔ اور امیر معاویہ پہلے شخص تھے۔ جنہوں نے مکہ میں منبر پر سے خطبہ دیا۔ ورنہ اس سے قبل خلفاء اور والیان مکہ جمعہ کا خطبہ زمین پر کھڑے ہوکر اور کعبہ کی طرف رُخ کر کے پڑھا کرتے تھے۔ امیر معاویہ کا منبر خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے تک باقی رہا، اور اس کی صرف مرمت کی جاتی رہی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ایک مرتبہ حج کیا تو اس کے عامل مصر، موسےٰ بن عیسےٰ نے ایک بڑا منقوش منبر جس کے نو درجے تھے۔ تحفے میں اس کے پاس بھیجا۔ یہ منبر مکّہ میں نصب کیا گیا اور امیر معاویہ کا منبر عرفات میں منتقل کرایا گیا۔ پھر خلیفہ واثق باللہ نے حج کا ارادہ کیا تو حکم دیا کہ اس کے لئے تین منبر بنائے جائیں۔ ایک مکہ میں، ایک منیٰ میں، اور تیسرا عرفات میں نصب کیا جائے۔ چنانچہ ازرقی کے عہد تک ہارون اور واثق کے منبر ہی مکہ میں تھے[1]۔

بنی امیہ کے عہد میں منبر کے متعلق ایک اور تبدیلی واقع ہوئی۔ عید کے موقعہ پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ آپ بجائے مسجد نبوی کے ایک مصلی میں نماز پڑھاتے تھے۔ جو مدینہ کے دروازوں کے باہر تھا، اور اُسمیں اور مسجد نبوی میں ایک ہزار ذرع کا فاصلہ تھا۔ حضرت جابر بن عبد اللہ نے بیان کیا ہے کہ عید میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ آپ مصلی میں تشریف لائے اور سب سے پہلے نماز پڑھائی۔ پھر لوگوں کو مخاطب کیا۔ وہاں سے ہٹ کر آپ عورتوں میں تشریف لائے۔ اس وقت آپ حضرت بلال رض کے ہاتھ پر سہارا دیئے ہوئے تھے۔ آپ نے عورتوں کو نصیحتیں کیں۔ حضرت بلال کپڑا پھیلائے ہوئے تھے اور عورتیں اپنا اپنا صدقہ اس میں ڈالتی جاتی تھیں[2]۔ نماز پڑھنے کے بعد لوگ

---

[1] ازرقی، تاریخ مکہ، مطبوعہ یورپ ص ۳۳۳، [2] صحیح بخاری (بہامش فتح الباری) ج ۲۔ ص ۳۷۷، ارشاد الساری ج ۲۔ ص ۲۰۲۔ پوری روایت یوں ہے: عن جابر بن عبد اللہ قال سمعتہ (بقیہ بر صفحہ ۶۰)

صفوں میں بیٹھے رہتے اور آپ ان کے سامنے زمین ہی پر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے[1]۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد میں یہی دستور رہا۔ حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا تو انہوں نے اس طرز عمل میں تبدیلی کی۔ اور مٹی کے بنے ہوئے منبر پر سے (علی منبر من طین[2]) جسے حضرت کثیر بن الصلت نے بنایا تھا۔ خطبہ دیا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۹) (اے ابن عباس) یقول ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قام فبدأ بالصلاۃ ثم خطب الناس بعد فلما فرغ نبی اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نزل فاتی النساء فذکرھن و ھو یتوکا علی ید بلال وبلال باسط ثوبہ یلقی فیہ النساء صدقۃ، قسطلانی نے نزل کے معنے انتقل لئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ آپ منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے اور پھر اس پر سے اترتے تھے۔ نزل کی توضیح صحیح بخاری کی ایک اور حدیث سے ہوتی ہے۔ جو نماز عید ہی کے متعلق ہے اور حضرت ابوسعید الخدری سے مروی ہے: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخرج یوم الفطر و یوم الاضحی الی المصلی۔ فاول شیئ یبدأ بہ الصلاۃ۔ ثم ینصرف فیقوم مقابل الناس والناس جلوس علی صفوفھم فیعظھم و یوصیھم ویامرھم۔ فان کان یرید ان یقطع بعثاً (اے مبعوثاً من الجیش الی الغزو) قطعہ او یامر بشیئ امر بہ ثم ینصرف (الی مدینۃ)۔ ارشاد الساری ج ۲ ص ۲۰۰، یہاں اس کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ خطبہ کا مصرف وعظ و نصیحت کے علاوہ کچھ اور بھی تھا اور حضرت عمرؓ نے جب منبر پر بیٹھ کر مشورہ کیا ہے تو وہ سنت نبوی کی پیروی کر رہے تھے،

(حواشی صفحہ ہذا) [1] ارشاد الساری ج ۲ ص ۱۹۹، ۲۰۰، [2] اس قسم کے منبر من طین کی حقیقت یوں واضح ہوتی ہے کہ بعض ارباب السیر کا قول ہے کہ مسجد نبوی میں لکڑی کے منبر سے قبل آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مٹی کے منبر پر سے خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ سمہودی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس منبر سے مراد مٹی کا بنا ہوا بلند و مرتفع چبوترہ ہو۔ ج ا ص ۲۸۱۔ حضرت عثمانؓ کے مٹی کے بنے ہوئے منبر کے متعلق بھی بیان کیا گیا ہے۔ کہ کثیر بن الصلت کو یہ کام اس وجہ سے سپرد ہوا تھا کہ ان کا مکان مصلی کے قریب تھا۔ اسی طرح سیوطی نے اپنی تاریخ الخلفاء میں بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے شام میں "علی منبر من طین" خطبہ دیا تھا۔ ص ۲۳۹،

لیکن آپ نے غالباً صرف ایک ہی مرتبہ ایسا کیا تھا، اور پھر سنت نبوی کی پابندی کرتے رہے۔ اس کی وجہ شاید نمازیوں کی زیادتی تھی۔ چنانچہ اسی سبب سے آپ نے یہ قاعدہ جاری کیا تھا کہ جمعہ کے دن امام کے سامنے اذان دینے کے علاوہ ایک اور اذان زوراء میں دی جائے، جو مدینہ کے بازار میں ایک بلند مقام تھا[۱]۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے منبر نبوی کو مسجد سے مصلی میں منتقل نہیں کیا تھا۔ بلکہ خود مصلی ہی میں مٹی کا منبر بنوالیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے ایک اور نئی بات یہ بھی کی کہ عید کی نماز سے قبل خطبہ پڑھا۔ مگر منبر کی طرح قبل از نماز خطبہ بھی صرف ایک ہی دفعہ ہوا۔ پھر آپ نے دیکھا کہ بعض لوگوں کو نماز نہیں ملی۔ اس لئے آپ نے دوبارہ نماز عید سے قبل خطبہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد جب حضرت امیر معاویہ ۴۴ھ میں مدینہ آئے تو آپ نے مسجد نبوی میں مقصورہ بنایا۔ عیدین میں منبر کو مصلی میں باہر نکال کر لائے۔ اور نماز سے قبل خطبہ پڑھا۔ یہی طرز عمل امیر معاویہ کے حاکم عراق، زیاد بصرہ میں اور حاکم مدینہ، مروان، نے مدینہ میں اختیار کیا۔ لیکن اس بدعت کی ذمہ واری امیر معاویہ پر عائد کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں خلیفہ ہی کی پیروی کر رہے تھے اور انہیں کے زیر حکم تھے۔ حضرت ابوسعید الخدری نے مروان پر اعتراض کیا تھا کہ یہ بدعت ہے۔ مروان نے اس کا جواب دیا تھا کہ یہ بدعت نہیں بلکہ خیر ہے۔ کیونکہ لوگوں کی کثرت ہوگئی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آواز سب تک پہنچ جائے[۲]۔

---

[۱] فتح الباری ج ۲ ص ۳۲۷، [۲] یعقوبی ج ۲ ص ۲۶۵، فتح الباری ج ۲ ص ۳۷۴، ارشاد الساری ج ۲ ص ۲۰۰، سنن ابی داؤد (بہامش موطا مالک بن انس مطبوعہ مصر) ج ۱ ص ۳۱۳، ابن الحاج: المدخل۔ ج ۲۔ ص ۱۴۰، مدینہ میں منبر کے متعلق مروان کے طرز عمل کی توجیہ اس طرح کی گئی ہے کہ وہ سمجھتا تھا (بقیہ بر ص ۶۲)

اس کے علاوہ عہد اموی میں ایک اور تبدیلی یہ ہوئی۔ کہ اب سلطنت اسلام میں مختلف منبر قائم ہونا شروع ہو گئے۔ امیر معاویہ نے زیاد کو اپنا بھائی تسلیم کر کے اُسے کوفہ کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے اسے عزت و عظمت بخشی اور چاہتے تھے کہ اس کی توقیر میں برابر اضافہ ہوتا چلا جائے۔ انہوں نے اسے اجازت دی کہ وہ کوفہ میں اپنے لئے ایک منبر نصب کر لے[1]۔ پھر جب مروان بن الحکم خلیفہ ہوا تو اس نے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو مصر کا حاکم مقرر کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مروان کے انتقال پر اس کا دوسرا بیٹا عبدالملک خلیفہ ہوا۔ اب صورت یہ تھی کہ عبدالعزیز کسی حالت میں اپنے آپ کو خلیفہ سے کم نہیں سمجھتا تھا، اور خلیفہ کی اجازت کے بغیر من مانے کام کرتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بھی اپنے لئے مصر میں ایک منبر نصب کرا لیا تھا[2]۔ پھر ولید نے ۹۳ھ میں قرۃ بن شریک کو مصر کا والی مقرر کیا۔ اور حکم دیا کہ فسطاط کی مسجد دوبارہ تعمیر کرائی جائے۔ قرہ نے مسجد بھی تعمیر کرائی اور پرانا منبر ہٹا کر نیا منبر بھی نصب کرایا[3]۔ یہ ۹۴ھ کا واقعہ ہے

(بقیہ حاشیہ ص۶۱) کہ خطبہ سننے کی محافظت ہیئت کی محافظت سے زیادہ ضروری ہے: فرأى ان المحافظة على اصل السنة وهو استماع الخطبه اولى من المحافظة على هيئة فيها، ليست من شرطها، ارشاد الساری ج ۲ ص ۲۰۰،

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] بلاذری: انساب الاشراف (قلمی نسخہ) ورق ۳۸۹ منقول از بکیر، [2] وقيل هو منبر عبدالعزيز بن مروان۔ ابن تغری بردی ج ۱ ص ۸۰، [3] پرانے منبر کے متعلق مختلف روایات ہیں:- (۱) حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد فسطاط کی مسجد میں نصب ہوا تھا، (۲) عبدالعزیز بن مروان کا منبر تھا، (۳) زکریٰ بن مرقا، بادشاہ نوبہ نے، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے پاس تحفہ میں بھیجا تھا۔ تغری بردی ج ۱ ص ۸۰، الکندی (ص ۶۵)، سیوطی (حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۱۳۱) نے "المنبر الجديد" لکھا ہے اور تغری بردی (ج ۱ ص ۸۰) میں "المنبر الحديد" ہے یہ تصحیف ہے۔ دراصل جدید ہی ہونا چاہئے،

قرہ کے اس منبر کے متعلق بیان ہوا ہے کہ: انہ لایعلم الیوم فی جند من الاجناد اقدم منہ بعد منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1]۔ فسطاط سے باہر اس وقت تک مصر کے کوروں میں بھی منبر نہیں تھے۔ بہرحال قرۃ بن شریک کا منبر خلیفہ عزیز فاطمی کے زمانے تک رہا، اور ۳۷۹ھ میں اس خلیفہ کے وزیر یعقوب بن کلس نے اسے ہٹا کر ایک مذہب منبر رکھوایا[2]۔ ۱۳۲ھ میں عبدالملک بن مروان بن موسے بن نصیر حاکم مصر کو آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد نے حکم دیا کہ کوروں میں منبر نصب کئے جائیں۔ اس سے قبل کوروں کے والی "علی العصی" خطبہ دیا کرتے تھے[3]۔

---

[1] یہ الکندی (ص ۶۵) کے الفاظ ہیں۔ ابن تغری بردی (مطبوعہ یورپ ج ۱ ص ۸۰) میں جند من الاجناد کے الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔ لفظ جند شام کے لئے مخصوص ہے۔ وہاں پانچ اجناد تھے: جند قنسرین، جند فلسطین، جند حمص، جند دمشق اور جند اردن۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ الکندی مصر کا مقابلہ مرکزی صوبہ شام سے کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ قرہ بن شریک کا منبر، جو فسطاط میں نصب کیا گیا تھا، وہ شام کے تمام منبروں کے مقابلہ میں منبر نبوی کے بعد قدیم ترین ہے۔ یہاں غالباً جند شام کو خارج کر دیا گیا ہے۔ بیکر کو ابن تغری بردی کے الفاظ سے مغالطہ ہوا ہے اور اسی وجہ سے اس نے اس مؤرخ کے قول کو مشتبہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ قرہ بن شریک کے منبر سے قبل بہت سے منبر نصب ہو چکے تھے۔ مگر الکندی کو تمام سلطنت اسلام سے غرض نہیں۔ وہ صرف مصر کا مقابلہ شام سے کر رہا ہے۔ اجناد شام کے منبروں کی تاریخ کا ہمیں علم نہیں، اس لئے فی الحال ہمیں الکندی کے قول کو درست ماننا پڑتا ہے۔ اسکے علاوہ بیکر نے منبر جدید کو اسم علم سمجھ لیا ہے جو ظاہر ہے کہ درست نہیں۔

[2] ابن تغری بردی۔ ج ۱ ص ۸۰۔ [3] ابن تغری بردی ج ۱ ص ۸۰۔ الکندی ص ۹۴۔ یہاں ابن تغری بردی میں عجیب وغریب تصحیف ہوئی ہے۔ اول تو بجائے عبدالملک بن مروان بن موسے بن نصیر کے صرف موسے بن نصیر چھپ گیا ہے۔ اس غلطی کا ازالہ الکندی ص ۹۴ سے ہوتا ہے۔ جہاں بالکل صحیح طور پر عبدالملک بن مروان النصیری لکھا ہے۔ دوسرے، اس سے بھی زیادہ گمراہ کن تصحیف "منابر فی القری" ہے۔ (بقیہ بر صفحہ ۶۴)

بنی امیہ کے متعلق ایک اور بات قابل ذکر ہے۔ امیر معاویہ شروع میں بپابندئ سنت نبویؐ کھڑے ہوکر خطبہ دیا کرتے تھے۔ مگر جب آپ اتنے موٹے ہوگئے کہ کھڑے ہونے سے معذور ہوگئے تو بیٹھ کر خطبہ دینے لگے[1]۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ پہلا خطبہ بیٹھ کر اور دوسرا کھڑے ہوکر دیتے تھے[2]۔ اس کے بعد جیساکہ عبدالرحمٰن بن الحکم کے متعلق ہم بیان کرچکے ہیں۔ بنی امیہ کا یہ دستور ہوگیا تھا کہ وہ بیٹھ کر ہی خطبہ دیتے تھے۔ چنانچہ عبدالملک کا بھی یہی دستور رہا تھا[3]۔ ۹۰ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک نے حج کیا۔ پہلے وہ مدینہ گیا، اور منبر نبویؐ پر سے اس حالت میں خطبہ دیا کہ قلنسوہ اس کے سر پر تھی، اور دُرّاعہ[4] پہنے ہوئے تھا اور بغیر رداء کے منبر پر آیا تھا۔ وہ حاضرین کو سلام کرکے بیٹھ گیا۔ مؤذن نے اذان کہی۔ پھر خلیفہ نے پہلا خطبہ بیٹھ کر دیا، اور دوسرے کے لئے کھڑا ہوا۔ اہل مدینہ کو خلیفہ کا یہ طرز عمل برا معلوم ہوا۔ مگر رجا بن حیوۃ نے کہا کہ حضرت عثمانؓ کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ لیکن لوگوں نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ "گو رجاء بن حیوۃ نے غالبًا انہیں یعنی بنی امیہ کو یہی سمجھا دیا ہے[5]"۔ غالبًا حضرت عثمانؓ کے طرز عمل کی پیروی کرتے ہوئے

(بقیہ صفحہ ۶۳) الکندی میں "منابر فی الکُوَر" ہے اور یہی درست ہے۔ لفظ کُورہ کا اطلاق ایک علاقے پر ہوتا تھا۔ جیسے موجودہ ہندوستان میں ضلع یا کمشنری کا۔ مثلاً دہرا بجر دنارس کا ایک شہر ہے۔ اسکے متعلق جتنے گاؤں اور قریے تھے، ان سب کو ملاکر کورۂ دار بجرد کہا جاتا تھا۔ اس سے قطعًا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۲ھ میں خود مصر میں بھی قریوں میں منبر نہیں بنے تھے الکندی کے قول کی تصدیق ابن تغری بردی (ج ۱ ص ۳۵۱) سے بھی ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ دیکھو ص ۳۵۰ سطر ۱۵،

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] فتح الباری۔ ج ۲۔ ص ۳۳۳، [2] کتاب العیون والحدائق (حالات ولید بن عبدالملک) ص ۱۱، [3] ایضًا، [4] عند الیھود ثوب من کتان کان یلبسہ عظیم احبارھم اقرب الموارد، [5] عیون والحدائق۔ ص ۱۱، یعقوبی ج ۲۔ ص ۳۴۱، ابن تغری بردی ج ۱ ص ۲۴۹،

امیر معاویہ نے بھی منبر پر کپڑے کا غلاف چڑھایا تھا[1] اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خطبے کے متعلق حجاز اور شام کے طرز عمل میں ایک بیّن فرق تھا۔ اہل حجاز ابھی تک پرانی رسم کی پابندی کر رہے تھے۔ اور شام میں بنی امیہ نے ایک نیا طرز عمل اختیار کر لیا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانے میں خطبہ کے متعلق اجماع امت ہوا اور کب اس معاملے میں سنت نبوی کی پیروی کی جانے لگی۔ غالباً یہ تبدیلی بنی امیہ کے زمانے میں تو نہیں ہوئی ہوگی۔ عباسیوں نے جہاں بنی امیہ کی اور باتیں ترک کی تھیں۔ وہاں انہوں نے یہ دستور بھی چھوڑا ہوگا۔ اور نئے سرے سے سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جاری کیا ہوگا*

اب ہم چند ادبی شواہد پیش کرتے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوگا کہ بنی امیہ کے زمانے میں کس طرح عامۃ الناس بھی منبر کو تخت شاہی کے مترادف سمجھنے لگے تھے خلیفہ ہشام بن عبد الملک کی تعریف میں فرزدق کہتا ہے ؎

ومن ورث العودین والخاتم الذی لہ الملک والارض الفضا ورحیبھا[2]

یہاں "عودین" سے مراد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا منبر و عصا ہے۔ فرزدق نے ان کے ساتھ خاتم کو بھی خلافت کی نشانی قرار دیا ہے۔

امیر معاویہ کے مرثیہ کے دوران میں بطل ابن الغادرین کہتا ہے[3] ؎

رکوب المنابر وثابھا + معن بخطبتہ مجھر

تریع الیہ عیون الکلام اذا حصر الھذر المھمر

یہاں الفاظ رکوب المنابر قابل غور ہیں۔

ان اشعار سے زیادہ واضح یحیی بن ابی حفصہ کے اشعار ہیں جن میں

[1] طبری ج ۲ ص ۲۰۲ [2] دیوان مطبوعہ بیروت۔ ص ۱۶

[3] الاغانی۔ ج ۶۔ ص ۳۳

اس نے خلیفہ عبدالملک کی موت کے بعد نئے خلیفہ کو خوش آمدید کہا ہے[1]

بکتِ المنابر یوم مات وانّما | بکت المنابر فقد فارسهنه
لما علاهن الولید خلیفة | فقلن ابنهُ ونظیرهُ فسکنَّنه
ولو قُرع المنابر بعده | لنکرنه فطرحنه عنّهنَّه

غالباً اور بھی زیادہ واضح شعر عبداللہ بن محمد بن ابی عُیَینہ کا ہے[2]

کأنَّ قصور القوم ینظرن نحوه | الی ملاءٍ موفٍ علی منبر المُلکِ

پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مدح میں فرزدق کا ایک شعر ہے[3]

ولن یزال امام منهم ملاکٌ | الیه یشخص فوق المنابر البصر

اس کا ذکر کر دینا بھی شاید نامناسب نہ ہوگا کہ جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر میں خلافت فاطمیین کو ختم کیا ہے تو ایک سنی مورخ نے لکھا تھا کہ سلطان نے "منابر الباطل" کا استیصال کر دیا[4]

(۵)

عہد عباسیہ کی ابتدا ہی سے معلوم ہونے لگتا ہے کہ اسلام کی سیاست، معاشرت بلکہ زندگی کے ہر شعبہ پر نئے نئے اثرات پڑ رہے ہیں۔ اور بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ انہیں میں منبر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہا۔ اس کی پرانی حیثیت ختم ہونے لگی۔ بنی امیہ کی یہ کوشش تھی کہ حتے الامکان عربوں کے تفوق کو برقرار، اور عربی روایات کو زندہ رکھا جائے۔ اس سعی و کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ اسی وجہ سے اگر ان کے عہد کو قدیم عربی تمدن کا

---

[1] اغانی۔ ج ۹ ص ۳۶، [2] ابن قتیبہ۔ کتاب الشعر والشعراء۔ مطبوعہ یورپ ص ۵۶۰، اغانی ج ۱۰ ص ۱۴، یہ شعر ایک قصر کی تعریف میں ہے۔ ابن قتیبہ نے اس کے اور شعر بھی نقل کئے ہیں،

[3] دیوان۔ مطبوعہ بیروت ص ۲۲، [4] کتاب الروضتین ج ۱ ص ۱۹۹، ۲۴۳ الخ؛ ۲۴۹۔ منقول از بیکر،

آخری دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ لیکن اس اثنا میں وہ عرب جو خراسان میں بس گئے تھے۔ یا فوجی ضروریات کی بناء پر بسائے گئے تھے۔ بڑی سُرعت کے ساتھ بدلتے جا رہے تھے۔ انہوں نے عراق و شام کے عربوں کے برعکس ایرانیوں میں شادی بیاہ کرنا شروع کر دیا۔ اور ان کے اکثر رسم و رواج کو بھی اختیار کر لیا۔ اسی وجہ سے ان میں عربی اور عجمی دونوں تہذیب و تمدّن کے اثرات آ گئے تھے۔ یہی خراسانی عرب تھے۔ جو ۱۳۲ھ کے انقلاب میں عباسیوں کے ممد و معاون بنے اور جنھوں نے انہیں گمنامی سے نکال کر خلیفہ بنا دیا۔ یہی لوگ اُس نئی مخلوط تہذیب کے بانی تھے جس میں عربی اور عجمی دونوں عناصر شامل تھے اور یہی تہذیب عہد عباسیہ کی خاص چیز ہے۔ ان عربوں کے تحت جس نئی تہذیب کی بنیاد بغداد میں پڑی اس میں عربی عناصر کا کافی اثر موجود تھا گو عجمیت بھی اس پر برابر اپنا اثر کر رہی تھی، بلکہ یہ کہنا خلافِ واقعہ نہ ہوگا۔ کہ عجمی اثرات برابر بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ خالص عرب یعنی شام و عراق کے رہنے والے، جو اموی روایات کے حامل تھے۔ اب رفتہ رفتہ الگ ہوتے گئے اور خراسانی عرب ان کی جگہ لیتے گئے۔ عجمی اثرات کے تحت اب خلیفہ کی وہ حیثیت بھی نہیں رہی۔ جو عہد اموی میں تھی۔ بنی امیہ کے خلفاء۔ اگر دیکھا جائے تو ایک بڑے پیمانے پر عربوں کے شیخ تھے۔ عوام ان سے واقف تھے، اور وہ بھی جہاں تک ہو سکتا تھا اپنے آپ کو عوام سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے لیکن اب عباسی خلفاء حقیقی معنوں میں بادشاہ تھے۔ انہوں نے ایسی شان و شوکت کی زندگی بسر کرنی شروع کی جس کی مثال بنی امیہ میں نہیں ملتی۔ جہاں تک ممکن ہوا وہ عوام سے الگ رہے۔ رفتہ رفتہ خلیفہ نے خطبہ دینا چھوڑ دیا اور اس وجہ سے خطیبوں کی ایک جماعت بننے لگی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ امام کے ساتھ

رئیس کا منبر پر بیٹھنا بھی بدعت سمجھا جانے لگا۔[1]

یہ تبدیلی عہد عباسیہ کے شروع ہی میں پائی جاتی ہے، اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سو برس کے اندر اندر خطیب کو ایک خاص درجہ حاصل ہوگیا تھا لیکن ارتقائی منازل کا سراغ لگانا اب تقریباً ناممکن ہے۔ بہرحال اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اموی دور کے مقابلے میں اب منبروں کی کثرت ہوگئی تھی۔ خود دارالخلافہ میں بھی خلیفہ کے متعلق شاذ ہی ذکر آتا ہے کہ اس نے خطبہ دیا تھا۔ یہی حال صوبوں کے والیوں کا ہے اسی وجہ سے عباسی دور میں اس بات پر زیادہ زور دیا جانے لگا کہ خطبہ میں خلیفہ کا نام لیا جائے۔ کیونکہ یہی ایک ذریعہ باقی رہ گیا تھا جس سے خلیفہ اپنی شخصیت کو عوام میں نمایاں کر سکتا تھا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ عجمیت کا زور بڑھا اور عجمی حکومتیں قایم ہوتی چلی گئیں۔ ان میں سے بعض حکومتیں ایسی تھیں جنکی ابتدا خلفاء کے مقرر کردہ والی سے ہوئی تھی اور اسی والی کی اولاد اس صوبے پر خودمختارانہ، یا کم از کم نیم خودمختارانہ طور پر حکومت کرنے لگی تھی۔ حکومت کی ایک اور قسم وہ تھی جسے اصطلاح میں "امارۃ الاستیلا" کہتے تھے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ کوئی منچلا سردار تلوار کے زور سے ایک علاقہ پر قبضہ کر لیتا تھا، اور خلیفہ کو اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ اپنے اقتدار کو قایم رکھنے کے لئے اسی مستولی سردار کو اپنی طرف سے حاکم مقرر کردے۔[2] ایسی حالت میں اور بھی زیادہ ضروری تھا کہ خلیفہ کو بھلایا نہ جائے۔ چنانچہ خطبے میں خلیفہ کا نام لئے جانے پر اصرار بڑھتا گیا اس کی ایک ہی مثال کافی ہوگی۔ ۲۰۵ھ میں خلیفہ مامون نے طاہر بن حسین کو خراسان کا والی مقرر کیا۔ ۲۰۷ھ میں وہ ایک صبح اپنے بستر پر مُردہ پایا گیا۔

---

[1] ابن الحاج۔ کتاب المدخل ج ۲ ص ۱۴۰، [2] فهو ان یستولی الامیر بالقوة علی بلاد یقلده الخلیفة امارتها و یفوض الیه تدبیرها و سیاستها۔ الماوردی۔ الاحکام السلطانیه۔ مطبوعہ مصر۔ ص ۲۷،

شبہ کیا جاتا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ اس پر الزام یہ تھا کہ صاحب البرید نے خلیفہ کو اطلاع دی تھی کہ طاہر بن حسین نے ایک جمعہ کے خطبے میں اس کا نام نہیں لیا تھا۔

اس کے بعد چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں ایک دوسرا اور بدتر دور شروع ہوا۔ اس دور میں خلیفہ کا اقتدار اس قدر گھٹ گیا تھا کہ خود دار الخلافہ پر بجائے خلیفہ کے بنی بویہ قابض تھے۔ اور خلیفہ کے گذارے کے لئے ان سلاطین نے اس کا روزینہ مقرر کر دیا تھا۔ یہ عجیب گومگو کا زمانہ تھا۔ قانوناً خلیفہ تمام مسلمانوں کا حکمران تھا۔ مگر اصلی اقتدار بنی بویہ کے ہاتھ میں تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ خلیفہ طوعاً و کرہاً اپنے اقتدار کی تمام مخصوص نشانیاں بھی کھو بیٹھا تھا اور سلاطین ان میں برابر کے حصہ دار بن گئے تھے۔ ایسی حالت میں سوال یہ تھا کہ منبر پر سے خطبہ کس کے نام کا پڑھا جائے۔ اس مسئلے کا فیصلہ یوں ہوا کہ خطبوں میں برسر منبر خلیفہ کے بعد سلطان وقت کا نام بھی لیا جانے لگا۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ خطبوں میں نام کا لیا جانا خاص طور پر حکومت کی نشانی سمجھا گیا۔ اور ہر وہ شخص جو اپنے قوت بازو سے چھوٹے سے علاقے پر قابض ہو جاتا تھا منبر پر سے خلیفہ کے بعد اپنے نام کا اعلان کرنے پر اصرار کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے مؤرخ جب کسی ایسے علاقے کے حالات لکھتے ہیں۔ جہاں انتشار و فساد پھیلا ہو تو اس کا ذکر ضرور کر دیتے ہیں کہ منبر پر خطبہ فلاں حکمران کے نام پڑھا جاتا تھا۔

لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ کمزور حکمرانوں کو بوقت ضرورت اپنے ہمسایوں سے مدد مانگنی پڑتی تھی۔ اور معاہدے کرنے پڑتے تھے۔ ایسی حالت میں وہ مجبوراً اپنے آپ کو کسی طاقتور حکمران کی پناہ میں دے دیتے تھے۔ اس قسم کی سیادت قایم کرنے کا واحد ذریعہ یہ تھا کہ اس حکمران کے نام کا اعلان منبروں پر سے

کیا جائے۔ مگر خود وہ فرمانروا، جو زیر سیادت آنا چاہتا تھا، اسے پسند نہ کرتا تھا کہ اپنے اقتدار کو بالکل ہی زائل ہونے دے۔ اقتدار کی نشانی یہ تھی کہ منبروں پر سے اس کے نام کا اعلان بھی کیا جائے۔ مگر خلیفہ قانوناً سب کا مقتدر اعلیٰ تھا اسلئے ایسی حالت میں خلیفہ، پناہ دہندہ سلطان اور اصلی حکمران تینوں کے ناموں کا اعلان یکے بعد دیگرے منبروں پر سے ہوتا تھا۔ اس کی ایک دلچسپ مثال سیف الدولہ حمدانی کے بیٹے سعد الدولہ، حکمران حلب، کی ہے۔ اس کی تمام زندگی عجیب کشمکش میں گذری، اور اسے ہمیشہ مدد و تعاون کی ضرورت پڑتی رہی۔ ۳۶۸ھ میں وہ بنی بویہ کے سلطان عضد الدولہ سے مدد مانگنے پر مجبور ہوا اس کے بدلے میں سعد الدولہ نے حکم دیا کہ حلب کی جامع مسجد میں پہلے خلیفہ الطائع عباسی، پھر عضد الدولہ اور پھر خود اس کا نام منبر پر سے لیا جائے۔ اس طرح رفتہ رفتہ بجائے خلیفہ اور اس کے والیوں کے خطبوں کے منبر صرف اس لئے رہ گیا کہ ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو حکمران بنائے۔ اس کا نام خطبوں میں لیا جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ خطبے کا مفہوم بھی بدل گیا۔ ابتدائی زمانے میں خطبے کی وہی حیثیت ہوتی تھی جو آج کل انگریزی پارلیمنٹ میں شاہی تقریر کی ہوتی ہے۔ مگر اب خطبہ محض ایک رسمی چیز رہ گئی اور بس۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس عہد میں جب کہ منبر کے متعلق پرانی روایات اس طرح بدل رہی تھیں۔ سیاسیات میں منبر کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اور کسی حکمران کے نام کا منبر پر سے اعلان یہ معنے رکھتا تھا کہ وہی ایک مقام تھا جہاں سے حکمران کی حکومت کا اعلان ہو سکتا ہے۔ اور جس کسی کے نام کا اعلان اس طریقے پر ہو مسلمانوں کو اسے اپنا جائز اور قانونی حکمران سمجھنا چاہیئے۔ اس سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ پرانی روایات اب تک اتنی نہیں مٹی تھیں جتنی کہ بظاہر معلوم ہو رہی تھیں۔

لیکن اس کے باوجود عہد عباسیہ میں بھی ہر شہر اور قصبہ اس کا مجاز نہیں تھا کہ وہ منبر قایم کرلے۔ نہ ہر مسجد میں منبر کا وجود تھا۔ صرف بڑے بڑے شہروں میں جامع مسجدیں تھیں۔ اور صرف انہیں مسجدوں میں منبر پایا جاتا تھا۔ کسی شہر یا قصبے میں جامع مسجد کا ہونا اور منبر کا پایا جانا اس شہر یا قصبے کی بزرگی پر دلالت کرتا تھا۔ عرب جغرافیہ نویس، جن میں سے تقریباً سب کے سب عہد عباسیہ میں گزرے ہیں، شہروں کے حالات لکھتے ہوئے خاص طور پر اس کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ اُن میں جامع مسجد یا منبر تھا یا نہیں۔ اصطخری نے ایک بڑی جامع فہرست فارس کے ایسے مقامات کی دی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں منبر موجود تھا یا نہیں[۱]۔ اسکی بھی صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ ۳۵۸ھ میں نقفور، قیصر قسطنطنیہ نے اسلامی ممالک پر حملہ کیا اور ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم کیا۔ اس جنگ میں یونانیوں کے ہاتھوں مسلمانوں نے اتنا نقصان اٹھایا کہ شاید پہلے کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ چنانچہ مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ اس مہم کے دوران میں چھوٹے چھوٹے قریوں اور شہروں کے علاوہ نقفور نے اٹھارہ منبر حاصل کئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اٹھارہ ایسے شہر فتح کئے تھے جن میں منبر موجود تھا۔

اس زمانے کے بعد جب مسلمانوں میں اور بھی زیادہ انتشار پھیلا اور مرکزیت بالکل ہی ختم ہوگئی تو رفتہ رفتہ ہر مسجد جامع مسجد بن گئی اور ہر مسجد میں منبر قایم کردیا گیا چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ شہروں، بلکہ قریوں، کی چھوٹی سے چھوٹی اور گمنام سے گمنام مسجد میں بھی منبر ہے، اور اُسے مسجد کا جزو لاینفک سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس تغیر کا منزل بمنزل پتہ چلانا فی الحال ناممکن ہے۔

---

[۱] جغرافیہ خلافت مشرقی۔ مصنفہ لی اسٹرینج۔ مترجمہ محمد جمیل الرحمن۔ ص ۴۸۔

(۶)

گذشتہ اوراق سے معلوم ہو گیا کہ اسلام میں منبر و عصا کی ابتدا کس طرح ہوئی اور کیسے تاریخ کے ہر دور میں ان کے متعلق تبدیلیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جیسے اسلام کی کسی اور چیز میں خرق العادت کو کوئی دخل نہیں۔ ایسے ہی منبر بھی ایک خاص دنیوی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بنایا گیا، اور اُسے کبھی کسی زمانے میں بھی ایسی اہمیت حاصل نہیں ہوئی جسے مافوق العادت کہا جا سکے۔ لیکن صرف اسلام ہی ایک مذہب و معاشرت نہیں جس میں منبر و عصا استعمال ہوتا ہو۔ دیگر اقوام میں بھی یہ چیزیں پائی جاتی ہیں، اور آج کل مستعمل ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر اقوام میں یہ چیزیں خوارق عادت کے طور پر استعمال ہونا شروع ہوئیں، اور آج کل بھی بڑی حد تک ان میں یہ اثرات بتائے جاتے ہیں۔ شاید یہ ناموزوں نہ ہوگا کہ مختصراً یہ بیان کر دیا جائے کہ تاریخ عالم کے ابتدائی دور میں عصا و منبر سے کیا کام لیا جاتا تھا۔ اور کس طرح اس ابتدائی عہد کے اثرات بعض اقوام میں اب تک جاری ہیں ؎

ابتدائے زمانۂ تاریخ میں جب انسان نے خدا کا تصوّر اپنے ذہن میں قائم کیا تو لامحالہ اُسے اپنی ہی جیسی صورت اور اپنی جیسی صفات سے متصف کر دیا۔ پھر جب رفتہ رفتہ تہذیب و تمدّن میں ترقی ہوئی اور مذہب نے ایک خاص شکل اختیار کر لی تو مذہبی پیشواؤں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ اس جماعت کے افراد میں بھی وہی صفات موجود ہیں جو اس سے قبل انسان اپنے معبود میں پیدا کر چکا تھا۔ یہیں سے عصا اور کرسی کا **تخیل** شروع ہوتا ہے[1] ؎

کرسی بیٹھنے کے لئے ایک بلند مقام ہے۔ سوال یہ ہے کہ سب سے

---

[1] یہ حصہ بکیٹ سے ماخوذ ہے۔

بلند مقام پر کون بیٹھ سکتا ہے؟ وہی شخص اس کا مستحق ہے جو بلحاظ عزت و رتبہ حاضرین میں سب سے زیادہ بلند پایہ ہو۔ اسلئے دیوتا کو کرسی یا کسی بلند مقام پر بٹھایا گیا پھر اُس کے نائب، یعنی مذہبی پیشوا کو بھی یہ درجہ دیا گیا۔ کیونکہ دیوتا سے وہ نزدیک تر ہوتا ہے، اور اس میں بھی وہ صفات پائی جاتی ہیں۔ جو خود دیوتا میں موجود ہیں۔ رفتہ رفتہ اس اعلےٰ ترین خدمت، یعنی نیابت الٰہیٰ کے تین ٹکڑے ہو گئے۔ مذہبی خدمت، قضا اور دنیوی حکومت، لیکن پھر یہ تینوں ٹکڑے مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اور تمام خدمتیں مذہبی پیشوا میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اسلئے یہ کُرسی صرف اُسی شخص کو زیب دیتی ہے۔ جس میں یہ تینوں باتیں متحدہ طور پر الگ الگ پائی جاتی ہوں۔ اب انسان تو مرتے رہتے ہیں۔ لیکن خدائی صفات ہمیشہ باقی رہتی ہیں۔ مثلاً باپ کے بعد بیٹا بادشاہ ہوتا ہے، اور ایک پوپ کے مرنے پر دوسرا پوپ منتخب کر لیا جاتا ہے۔ مگر وہ پتھر جس پر تخت نشینی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اور وہ کرسی جس پر انتخاب کے بعد پوپ بیٹھتا ہے۔ بدستور باقی رہتی ہیں۔ اور ان کی وجہ سے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان نئے لوگوں میں بھی وہی صفات پیدا ہو گئی ہیں۔ اور ان کی وجہ سے وہ دیوتا یا خدا سے عوام کے مقابلے میں نزدیک ہو گئے ہیں، اور خاص طور پر مقدس و برگزیدہ سمجھے جانے کے لائق ہیں ؂

اب رہ گیا عصا۔ یہ قدیم زمانے میں عزت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ جس شخص کے ہاتھ میں عصا ہو وہ اس شخص کے مقابلے میں جو عصا نہ رکھتا ہو، زیادہ معزز سمجھا جاتا تھا کیونکہ عصا سے اپنی حفاظت بھی کی جا سکتی تھی اور دوسرے کو سزا بھی دی جا سکتی تھی اسی وجہ سے ابتدائی انسان نے دیوتا کی عظمت و کبریائی ظاہر کرنے کی غرض سے اس کے ہاتھ میں ایک عصا بھی دے دیا۔ اور پھر کرسی کی طرح اس کے نائب ارضی کو بھی

عصا رکھنے کی اجازت دی، یا ان نائبان ارضی نے خود ہی اس پر قبضہ کرلیا چنانچہ ان ممالک میں جہاں بادشاہ اب تک موجود ہیں۔ عصا کا یہ تصور آج تک زندہ ہے، اور مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں بھی عصا ضرور رہتا ہے ؛

جو شخص دیوتا کے نائب ارضی کی خدمات انجام دے اس کے فرائض دو حصّوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اس کا ایک فرض تو یہ تھا۔ کہ دیوتا کی مرضی انسان تک پہنچا دے، اور دوسرا فرض یہ بھی تھا کہ جادو سحر کے ذریعے دیوتا کو مجبور کرے کہ وہ انسان کی مرضی پر چلا کرے۔ چنانچہ آج کل بھی دنیا کے بعض مذاہب، خصوصاً یورپ کے مذاہب میں، عصا کی یہ حیثیت نمایاں ہے۔ ایک شخص ایسے مذہبی پیشوا کے پاس، جسے معافیٔ معاصی کا اختیار دیا گیا ہو، آتا ہے، اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہے اور پیشوا اپنا عصا اس کے بدن سے چھوا کر کہتا ہے کہ تیرے گناہ معاف کر دیئے گئے۔ اس طرح سمجھا یہ جاتا ہے کہ محض عصا کے چھوانے سے تمام گناہ معاف ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ جادو کا اثر ہے۔ ایک زمانہ میں انہیں مذہبی پیشواؤں نے یہ کوشش کی تھی۔ کہ مذہبی اقتدار کے علاوہ انہیں دنیوی حکومت بھی حاصل ہو جائے اور اپنے اپنے علاقوں پر تو وہ اب تک حکمران ہیں۔ اسلئے ان کا عصا ایک طرف تو جادو کا عصا بن کر گناہوں سے معافی دلاتا ہے، اور دوسری طرف یہی عصا اس بات کی نشانی بھی ہے کہ وہ اپنے علاقے پر حکمران ہیں۔ اسی طرح ان کے عصا میں دینی اور دنیوی دونوں تصوّرات کام کر رہے ہیں۔ کسی زمانے میں بعض ملکوں میں دستور تھا کہ کسی مجرم کو سزائے (قتل) دینے سے قبل ایک عصا توڑا جاتا تھا جس کے یہ معنے تھے کہ اب اس مجرم کو حکومت سے کسی قسم کی توقعات نہیں رکھنی چاہییں ؛

سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ آج کل بھی اُسقف کی کُرسی گرجا کے وسیع مستطیل ہال میں، جسے بے سی لی کا کہتے ہیں، رکھی جاتی ہے تحقیقات سے

پتہ چلا ہے کہ زمانۂ قبل مسیح میں ان لوگوں کے قاضیوں کی کرسی، جنہیں اہل یورپ عرف عام میں بے دین Pagan کہتے ہیں۔ اسی بے سی لی کا میں رکھی جاتی تھی، یہی بے دینوں کی کرسی پہلے کی طرح آجکل بھی مذہبی، اور بعض موقعوں پر دنیوی اقتدار کی نشانی قرار دی گئی ہے۔ ہم دیکھ چکے کہ عربوں میں بھی ابتدائی زمانے میں منبر حاکم یا قاضی کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ قاضی اس زمانے میں یا اس کے بعد کبھی خدائی صفات کا حامل نہ تھا اور نہ اس کے منبر کو اسقف کی کرسی کی طرح کوئی مافوق العادت حیثیت حاصل تھی۔

حوالہ جات :-

(۱) تفسیر طبری۔ مطبوعہ مصر۔ ۱۳۲۱ھ،

(۲) خازن : لباب التاویل فی معانی التنزیل۔ مطبوعہ مصر ۱۳۲۱ھ،

(۳) بغوی : معالم التنزیل۔ بہامش خازن،

(۴) تفسیر ابن کثیر۔ برحاشیہ فتح البیان۔ لصدیق حسن۔ مصر ۱۳۰۱ھ،

(۵) تفسیر بیضاوی، اور حاشیہ علی البیضاوی۔ مطبوعہ مصر ۱۲۹۹ھ، حاشیہ علی البیضاوی مصر ۱۲۸۳ھ

(۶) امام ابن حجر عسقلانی : فتح الباری۔ مطبوعہ مصر،

(۷) قسطلانی : ارشاد الساری۔ مطبوعہ مصر ۱۳۰۷ھ،

(۸) کشاف۔ کلکتہ ۱۸۵۶ء (۹) ترمذی۔ مصر ۱۲۹۲ھ،

(۱۰) سنن ابی داؤد۔ نولکشور۔ لکھنؤ ۱۸۸۸ء،

(۱۱) سنن ابن ماجہ۔ اصح المطابع۔ دہلی ۱۳۱۵ھ،

(۱۲) سنن نسائی۔ مطبوعہ مصر۔ ۱۳۱۲ھ،

(۱۳) امام بخاری : التاریخ الصغیر۔ مطبع انوار احمدی۔ الہ آباد،

(۱۴) سمہودی : وفاء الوفاء باخبار دار المصطفےٰ۔ جلد ۱۔ مصر ۱۳۲۶ھ،

(۱۵) سیرۃ ابن ہشام : گوٹن گن ۔ مصححہ ووستنفلد ۱۸۵۹ء ،

(۱۶) ابن اثیر : اسد الغابہ جلد ۱ ۔ مصر ۱۲۸۰ھ ،

(۱۷) دیار بکری : تاریخ الخمیس ۔ جلد ۲ ۔ مصر ۱۲۸۳ھ و ۱۳۰۲ھ ،

(۱۸) تاریخ یعقوبی ۔ جلد ۱ و ۲ ۔ مصححہ ہوتسما ۔ بریل ۔ لیدن ۱۸۸۳ء ،

(۱۹) ابن تغری بردی : النجوم الزاہرہ ۔ جلد ۱ ۔ لیدن ۱۸۵۱ء ،

(۲۰) دینوری : الاخبار الطوال ۔ لیدن ۱۸۸۸ء ،

(۲۱) ازرقی : تاریخ مکہ ۔ مصححہ ووستنفلد ۔ لائپزگ ۱۸۵۸ء ،

(۲۲) مقریزی : الخطط و الآثار بولاق ۱۲۷۰ھ ،

(۲۳) ابن خلدون : مقدمہ ۔ بولاق ۱۳۲۰ھ ،

(۲۴) یاقوت الحموی : معجم البلدان ۔ مصر ۱۳۲۵ھ ،

(۲۵) تاریخ طبری ۔ لیدن ۱۸۸۳ء ۔ ۱۸۸۵ء ،

(۲۶) ابن اثیر : تاریخ کامل : مصر ۱۳۰۱ھ ،

(۲۷) سیوطی : تاریخ الخلفاء ۔ کلکتہ ۱۸۵۷ء ،

(۲۸) سیوطی : حسن المحاضرہ ، جلد ۱ و ۲ ۔ مطبوعہ مصر ۔ (تاریخ طباعت ندارد)

(۲۹) درۃ الغواص ۔ حریری : مصححہ تھوربیک ۔ لائپزگ ۱۸۷۱ء ،

(۳۰) امام غزالی : احیاء العلوم ۔ مصر ۱۳۰۶ھ ،

(۳۱) کتاب الاغانی ۔ مصر ۱۳۲۳ھ ،

(۳۲) فرزدق : دیوان ۔ بیروت ۱۳۵۳ھ ،

(۳۳) ابن قتیبہ : کتاب الشعر و الشعراء ۔ مصححہ دی خویہ ۔ لیدن ۱۸۷۵ء ،

(۳۴) ابن الحاج : کتاب المدخل ۔ جلد ۲ ۔ اسکندریہ ۱۳۹۳ھ ،

(۳۵) گولڈزیہر : Muhammed. Studien, Vol. I. II., Halle 1875

(۳۶) بیکر : Islam Studien vol I (Der Kanzel in Cultus des alten Islam, Berlin 1924) اس مضمون کا حوالہ بیکر کے نام سے دیا گیا ہے

(۳۷) لسان العرب - ابن منظور افریقی - بولاق ۱۳۰۸ھ ،

(۳۸) تاج العروس - زبیدی - مطبوعہ مصر ،

(۳۹) محیط المحیط ،

(۴۰) کتاب العیون والحدائق فی اخبار الحقایق مصححہ ژون بال - لیدن ۱۸۵۳ء

(۴۱) الکندی : کتاب الولاۃ والقضاۃ (اوقاف گب) بیروت ولیدن ۱۹۰۸ء ۔

(۴۲) بلاذری : فتوح البلدان - مصر ۱۳۱۸ھ ،

(۴۳) صحیح مسلم - مطبوعہ مطبعۂ دارالکتب العربیہ ۱۳۲۷ھ ،

محمد جمیل الرحمٰن ایم - اے ،

پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن)

آتشیں اسلحہ

(سلسلے کے لئے دیکھو یہی میگزین بابت ماہ اگست ۱۹۳۸ء)

ہندوستان

اب وقت آگیا ہے کہ ہم ہندوستان کی تاریخ کا جائزہ لیں اور اس ملک کے جنگی کارناموں کو اپنی تحقیقات کا مرکز بنالیں۔ غزنوی دور میں منجنیقوں اور نفط کا مذکور اگرچہ بہت کم ملتا ہے۔ مگر جنگوں میں ان کا استعمال یقینی ہے۔ مسعود غزنوی سنہ ۴۲۱ھ و سنہ ۴۳۱ھ نے جب قلعۂ ہانسی کا محاصرہ کیا ہے۔ ابوالفضل بیہقی کی روایت ہے کہ عروس جو منجنیق کی ایک خاص قسم ہے قلعہ پر لگائی گئی اور پانچ جگہ نقب زنی سے کام لیا چنانچہ :-

" و لشکر منصور خاصہ غلامان سرائی داد بداد ندو [بر] قلعہ همچنین عروس بر کار بود و آخر سمج گرفتند پنج جای و دیوار فرود آوردند و بشمشیر آن قلعہ بستدند۔"
(تاریخ بیہقی صـ ۶۶۵)

غور کے حصار تر کی تسخیر کے وقت بھی مسعود انہی آلات سے کام لیتا ہے،

" لشکر را فرمود تا هر چہار جانب فرود آمدند و ہمہ شب کاری ساختند و منجنیق می نهادند۔ چون روز شد امیر برنشست و پیش کار رفت بنفس عزیز خویش و منجنیقها بر کار کردو سنگ روان کردند و سمج گرفتند از زیر دو برج کہ برابر امیر بود . . . و سنگ منجنیق باتیر بارشد . . . وقت نماز پیشین دیوار بزرگ از سنگ منجنیق بیفتاد و گرد و خاک و دود آتش بر آمد و حصار رخنہ شد و غوریان آنجا بر جوشیدند و